مینائے غزل - از جناب بشیر فاروق، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۹۲، مجلد مع گردپوش قیمت ۳ پتہ مکتبہ لالہ زار چیپ جون بلڈنگ، الفنسٹن اسٹریٹ، کراچی۔

یہ جناب بشیر فاروق (کوئٹہ) کا مجموعہ کلام ہے، اس سے ان کی قادر الکلامی اور خوش مذاقی کا اندازہ ہوتا ہے، شاعر کا غم "غم جاناں" کے بجائے "غم دوراں" ہے، "تلاش" و "تلاطم" میں ان کا اصل رنگ نمایاں ہے، باطنی محاسن کے ساتھ طرز ادا و بیان کی خوبیوں سے بھی کلام آراستہ ہے، شروع میں جناب جگر مرادآبادی، رئیس امروہوی اور خواجہ عبدالحمید عرفانی نے شاعر کا تعارف اور اس کے کلام کی خصوصیات بیان کی ہیں،

المطالعة العربية حصہ اول و دوم - مولفہ جناب ابوبکر شلی صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ معمولی کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۶۳، ۶۳، قیمت ۸/ ۸/ ناشر سندھ اکیڈمی، سکھر۔ مغربی پاکستان،

یہ عربی ریڈر عربی کے مبتدی طالب علموں کے لیے مرتب کی گئی ہے، اور اسباق کی مشقیں بھی دیدی گئی ہیں، وضاحت کے لیے تصویریں بھی ہیں، عربی زبان سیکھنے والوں کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے،

دیوان داؤد اورنگ آبادی - مرتبہ خالدہ بیگم صاحبہ چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۴، قیمت عہ نئے پیسے - پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدرآباد دکن

دکن کے مشہور شاعر سراج کے ہم عصر ایک دوسرے شاعر داؤد دکنی تھے، جنکا پایہ شاعری میں سراج سے کم نہ تھا، لیکن انکے کلام کو ویسی شہرت حاصل نہ ہوسکی، خالدہ بیگم صاحبہ نے انکا دیوان تین قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کرکے شائع کیا ہے جو داؤد کی استادی اور قادر الکلامی کا ثبوت ہے، دو سو سال قدیم ہونے کے باوجود کلام میں روانی اور سلاست ہے اور اسکے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی، دیوان کے شروع میں داؤد کے مختصر حالات اور انکے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے، اسکی اشاعت سے اردو شاعری کی تاریخ میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوا،

"ض"

جلد ۸۴ ماہ جمادی الاول ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۹ء نمبر ۵

فہرست مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۳۲۲-۳۲۵ / ۳
مقالات		
سید صاحب کی یادیں	جناب مولانا نجم الہدی صاحب ندوی	۳۲۵-۳۵۰
فقہ اسلامی کے مآخذ	جناب مولانا محمد تقی صاحب صدر مدرس دار العلوم معینیہ اجمیر	۳۵۱-۳۶۵
مسلمانوں کے ہندسی ادب کی ثروت	جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے	۳۶۶-۳۷۸
امام نسائی اور ان کی سنن	جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین	۳۷۹-۳۹۴
ادبیات		
غزل	جناب منظور علی صاحب فاروقی تمنا	۳۹۵
"	جناب سلام ساگری	۳۹۶
"	جناب کریم الرضا خانصاحب وکیل شاہجہانپور	"
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۳۹۷-۴۰۰

اعلان

شذرات

پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے بعد ادب و صحافت کے میدان میں سب سے ممتاز اور رنگارنگ شخصیت عبد المجید صاحب سالک مرحوم کی تھی، وہ ادیب و شاعر بھی تھے اور صحافی و مزاح نگار بھی، ان کا مذاق بڑا ستھرا اور قلم متوازن تھا، ایک زمانہ میں ان کی ذات لاہور کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھی، پنجاب کے بہت سے نوجوان ادیب و صحافی ان ہی کے دامن تربیت کے پروردہ ہیں، طبعاً بڑے باغ و بہار، سخن طراز اور بزم آرا تھے، انھوں نے علم و ادب کے ساتھ ملک و ملت کی بھی خدمت انجام دی، متعدد علمی و ادبی تصانیف ان کی یادگار ہیں، ان میں "مسلم ثقافت ہندوستان میں" ان کے حسن مذاق کا نمونہ ہے، ابھی تھوڑے دن ہوئے "ہم نہیں ہوں گے" کی ردیف و قافیہ میں ان کی ایک بڑی دلکش نظم نظر سے گذری تھی، کیا معلوم تھا کہ یہ شاعری اتنی جلد واقعہ کی شکل اختیار کرلے گی، علم و ادب کی محفلوں میں مدتوں ان کی یاد آتی رہے گی، اللہ تعالیٰ علم و ادب کے اس خادم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

گذشتہ مہینہ اعظم گڈھ کی ایک پرانی یادگار حاجی رشید الدین صاحب نے بھی وفات پائی، مرحوم ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی کے سگے اور مولانا شبلی مرحوم کے ماموں زاد بھائی تھے، دار المصنفین سے انکا تعلق بہت قدیم اور مخلصانہ تھا، اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے، مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کو ان ہی نے سنبھالا تھا، اور مدت تک اس کے ناظم رہے، ادھر چند سال سے ضعف پیری کی وجہ سے اس خدمت سے سبکدوش ہو گئے تھے، طبعاً بڑے نیک سیرت، پاک دل اور مرنجاں مرنج تھے، مولانا شبلی

کے اعزہ میں سب سے زیادہ سن رسیدہ اب وہی رہ گئے تھے، نوے سال کے قریب عمر تھی، ادھر کئی سال سے بالکل معذور ہو گئے تھے، ہوش و حواس نے بھی جواب دیدیا تھا، صرف رشتۂ حیات باقی تھا، افسوس کہ وہ بھی منقطع ہو گیا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت کاملہ سے نوازے۔

ابھی یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ مولوی سید محمد احمد صاحب کاظمی ایڈوکیٹ الٰہ آباد کے انتقال کی خبر ملی، مرحوم پرانے اور پکے کانگریسی تھے، ہر زمانہ میں اپنے مسلک پر قائم رہے، قوم پروری کے ساتھ دیندار بھی تھے، اور ان کے دل میں مذہب و ملت کا بھی درد تھا، اور مسلمانوں کے بعض مفید کام انھوں نے انجام دیے، پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے تھے، اور مسلمانوں کے نظام قضا کے متعلق ایک بل بھی پیش کیا تھا، لیکن پھر اس کے انجام کا پتہ نہ چلا، ایسے نیشنلسٹ اب مشکل سے ملیں گے، جو ملک و وطن اور مذہب و ملت کے حقوق میں توازن قائم رکھ سکیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کی ملی خدمات کو قبول اور ان کی مغفرت فرمائے۔

گذشتہ مہینہ بھارتیہ ودیا بھون بمبئی کی کتاب "دی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل" کے تذکرے کے سلسلہ میں ہم نے ہندوؤں اور ہندو مورخین کی فرقہ پرستی کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیے تھے، اس پر بعض ہندو دوستوں نے توجہ دلائی ہے کہ ان دونوں کی فرقہ پرستی کے متعلق یہ تعمیم صحیح نہیں ہے، ایسے ہندو مورخین بھی ہیں جن کا دامن تعصب و تنگ نظری سے پاک ہے، اور ان کی کسی تحریر سے مسلمانوں کو کوئی شکایت نہیں ہو سکتی، اسی طریقہ سے فرقہ پرست ہندوؤں کے مقابلہ میں قوم پرور ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے، اس لیے ان کو بڑی جماعت سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے، اور فرقہ پرستوں کی ٹکر تنہا مسلمانوں سے نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں

دو نظریوں اور دو قوتوں یعنی فرقہ پرستی اور قوم پروری میں مقابلہ ہے، اس لیے اسی نقطۂ نظر سے اسکو دیکھنا چاہیے اور اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہم اس نیک مشورے کے شکرگذار ہیں، یہ پہلو ہماری نگاہ سے مخفی نہیں تھا، اور اس سے انکار نہیں کہ آج بھی ایسے وسیع القلب، شریف الطبع اور منصف مزاج ہندو موجود ہیں جن سے مسلمانوں کو کوئی شکایت نہیں اور وہ ہندو مسلمانوں کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے، یہی حال قوم پرور ہندوؤں کا ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت دو نظریوں میں ٹکر ہے، مگر اس کا نشانہ مسلمان بنتے ہیں، یہ بھی قابل انگیز تھا، بشرطیکہ قوم پروروں کی نمایندہ جماعت کانگریس اپنے اصولوں پر قائم اور فرقہ پرستی سے پاک ہوتی اور جرأت و دلیری کے ساتھ فرقہ پرستی کا مقابلہ کرتی، اس وقت یہ امید ہوسکتی تھی کہ یہ صورت حال عارضی ہے اور کانگریس ایک نہ ایک دن فرقہ پرستی پر غالب آجائے گی، لیکن افسوس ہے کہ خود کانگریس میں فرقہ پرستوں کا غلبہ اتنا ہوگیا ہے کہ جو دو چار بچے کھچے سچے کانگریسی باقی رہ گئے ہیں وہ بھی ان کی مخالفت کی ہمت نہیں کرسکتے اور اگر کبھی کوئی آواز بلند ہوتی ہے تو اتنی کمزور ہوتی ہے کہ اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا حتی کہ پنڈت جواہر لال نہرو تک ان کے مقابلہ میں بے بس ہیں اور فرقہ پرستوں کی قوت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، ایسی حالت میں فرقہ پرستی کے استیصال کی شکل کیا ہے، اور مسلمان کس امید پر اور کب تک دل کو تسلی دیتے رہیں۔

اور شکایتوں کو جانے دیجئے، ایک اردو ہی کے مسئلہ کو لے لیجئے، جو بڑی حد تک ہندو مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ ہے، مگر مسلمانوں کو اس لیے اس سے زیادہ لگاؤ ہے کہ وہ ان کا تنہا لسانی نہیں بلکہ تہذیبی مسئلہ بھی ہے، اسی لیے اس کو قابل گردن زدنی قرار دیا گیا ہے اور پنڈت جواہر لال نہرو کی پرزور

تقریروں اور حکومت کے مسلسل وعدوں کے باوجود خود پنڈت جی کے وطن اور ان کی راجدھانی تک میں جو اردو کے مرکز ہیں، وہ زندگی کے سارے حقوق سے محروم ہے، اس لیے ہندو فرقہ پرستی کی شکایت کیا بیجا ہے، اور اس کے خلاف احتجاج کی اس کے سوا شکل کیا ہے کہ اس کے لیے آواز بلند کی جائے، اور جب پانی سر سے اونچا ہوجاتا ہے تو پھر قوم پروری اور فرقہ پرستی کے نازک حدود کا لحاظ رکھنا بڑا مشکل ہوجاتا ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کے دل پر گذرتی ہے۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کہ اب بھی سچے قوم پرور ہندوؤں کی ایک جماعت موجود ہے، جو ہندوستان کو صحیح جمہوری اور سیکولر راستہ پر لیجانا اور سب اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک چاہتی ہے، اسی سے حکومت کی جمہوریت اور سیکولرزم کا بھرم قائم ہے، اور یہ جماعت خواہ کتنی ہی چھوٹی اور اس کی آواز کتنی ہی کمزور ہو بہرحال تقویت اسی کو پہنچانا ہے کہ ملک کی فلاح کی امیدیں اسی سے وابستہ ہیں۔

دارالمصنفین کے بانی مولانا شبلی مرحوم کا نقطۂ نظر ہمیشہ قوم پرورانہ رہا اور وہ اس زمانہ میں کانگریس کے حامی تھے جب مسلمان جماعتی حیثیت سے اس سے الگ تھے، اور انھوں نے ہندو مسلمانوں کو قریب لانے اور ان کے درمیان غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے بڑے پرزور مضامین لکھے، اس لیے دارالمصنفین کی پالیسی بھی شروع سے یہی رہی اور اس کے کارکن علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس کی کوشش کرتے رہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے مضامین کے علاوہ اس مقصد کے لیے "عرب و ہند کے تعلقات" جیسی فاضلانہ اور بے مثل کتاب لکھی، اور اسی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے اسلامی دور کی پوری تاریخ دارالمصنفین سے مرتب و شائع کرنا چاہتے تھے اور اس کا پورا خاکہ انھوں نے معارف میں

شائع کیا تھا، اور اس کے لیے مورخین کا ایک بورڈ بھی بنایا تھا، یہ کام شروع بھی کیا گیا تھا، مگر مالی دشواریوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اب پھر دار المصنفین نے اس کو شروع کیا ہے، اور اس سلسلہ کی ایک کتاب "ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی ایک ایک جھلک" شائع ہو چکی ہے، اس میں ان تاریخی واقعات کو نمایاں کیا گیا ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں قربت و یگانگت پیدا ہو اور اس سلسلہ کی دوسری کتابیں زیر تالیف ہیں، دار المصنفین آیندہ بھی اسی راہ پر گامزن رہے گا،

اب ایک نیا اور آزاد ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے، اس لیے غلامی کے دور کے بہت سے تصورات اور سوچنے کے طریقوں کو بدلنے کی ضرورت ہے جس میں تاریخ بھی شامل ہے، اب محض تاریخ نگاری کا نہیں بلکہ تاریخ سازی کا دور ہے اور اس کی ذمہ داری ہمارے مورخین پر بھی ہے کہ وہ ایسی تاریخیں لکھیں جو قومی وحدت، ہندوستان کی ترقی و استحکام کے لیے مفید ہوں، نہ کہ اس کو نقصان پہنچائیں، ایسی تاریخیں لکھنا جن سے ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اختلاف و عناد پیدا ہو، ملک کے ساتھ دشمنی ہے، اس سلسلہ میں بعض جزوں کی وضاحت کی ضرورت تھی جس کی ان محدود صفحات میں گنجایش نہیں ہے، ہم آیندہ کسی موقع پر اس کی تفصیل پیش کریں گے۔

ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے بعد ہندوستان میں کوئی ایسا ادارہ نہ رہ گیا تھا جس میں اسلامی علوم و فنون کے ماہرین جمع ہو کر اپنی تحقیقات پیش کر سکیں، اس کمی کو محسوس کر کے ادارۂ علوم و فنون اسلامی مسلم یونیورسٹی نے اس کا ایک آل انڈیا ادارہ قائم کیا ہے جس کا پہلا جلسہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں علی گڑھ میں ہوا تھا، اب دوسرا جلسہ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۵۹ء کو علی گڑھ ہی میں ہوگا، امید ہے کہ اسلامیات سے ذوق رکھنے والے اصحاب علم اپنی شرکت اور اپنے مقالات سے اس کو کامیاب بنائیں گے۔

مقالات

سید صاحبؒ کی یاد میں

از

جناب مولانا نجم الہدیٰ صاحب ندوی

راقم الحروف علامہ سید سلیمان ندوی کا حقیقی ماموں زاد بھائی ہے، سید صاحب کی ولادت ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ میں ہوئی، اور راقم رجب ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوا، اس طرح وہ مجھ سے چھ مہینے چھوٹے تھے، لیکن بچپن سے ندوہ کی تکمیل تعلیم تک میرا ان کا ساتھ اس طرح رہا کہ میری زندگی کی تمام باتوں سے وہ واقف رہے اور میں ان کی ہر بات کا ہمراز رہا، اب وہ ساری باتیں خواب و خیال بنکر رہ گئی ہیں، لیکن ان کی خوشگوار یاد اب بھی میرے لیے سرمایۂ حیات بنی ہوئی ہے، جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور عزیزی سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا برابر تقاضا رہا کہ میں سید صاحب کے خاندانی اور ابتدائی زندگی کے حالات قلمبند کردوں لیکن میں کوئی اہل قلم نہیں، اس لیے اس کی تکمیل سے گھبراتا رہا، مگر دونوں عزیزوں کے مسلسل اصرار پر کچھ حالات پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، شاید برادرم شاہ معین الدین کو حیاتِ سلیمانی کی ترتیب میں ان میں کچھ کام کی باتیں مل جائیں،

سید صاحب کی ولادت دیسنہ میں ہوئی، جو بہار شریف ضلع پٹنہ سے آٹھ میل شمال مشرق میں واقع ہے، اس گاؤں کے آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانہ میں شاید یہاں سے جین یا بودھ مذہب

والوں کا کچھ تعلق رہا ہے، چنانچہ اب بھی بعض حصوں کی کھودائی کے وقت عہد عتیق کی اینٹیں اور پتھر نکلتے ہیں، ۱۳۰۲ھ سے قبل جب دیسنہ کی مسجد کی تعمیر ایک بلند مقام پر شروع کی گئی تو بنیاد کھودنے کے وقت اندر سے ہزاروں پختہ اینٹیں برآمد ہوئیں، جو ڈیڑھ فٹ مربع اور مستطیل اور تقریباً ۱½ انچ موٹی تھیں، یہی خداداد اینٹیں مسجد کی بنیاد میں کام آئیں، قیاس ہے کہ اس جگہ کوئی گڑھ رہا ہوگا جو اس کی تاریخی اہمیت کی دلیل ہے،

گاؤں کے چاروں طرف پٹھانوں کی قدیم بستیاں ہیں، خود دیسنہ میں بھی ایک دو گھر پٹھانوں کے رہ گئے ہیں، خیال یہ ہے کہ بہار میں جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو کچھ مسلمان تو شہروں میں آباد ہو گئے ہوں گے اور کچھ گاؤں میں پھیل گئے ہوں گے، اور جو مقامات جنگی حیثیت سے اہم تھے، وہاں پٹھان کثرت سے آباد ہو گئے، چند پٹھان خاندان اس "دیس نو" میں بھی آباد ہو گئے، جو بعد میں دیسنہ کے نام سے مشہور ہوا، پٹھانوں کے بعد سادات آئے اور ان کے بعد ملک آباد ہوئے،

دیسنہ کے دو حصے ہیں، جو زمینداری کے خاتمہ سے پہلے مہاراجہ ٹکاری ضلع گیا کے خالصہ آراضیات کا حصہ تھا، اور دیسنہ کا مشرقی حصہ کلیان پور دیسنہ یا ایمۂ دیسنہ کے نام سے موسوم ہے، اس کی مالگذاری مہاراجہ ٹکاری کو دینے کے بجائے سرکاری خزانہ میں داخل کیجاتی تھی، میری ذاتی تحقیق یہ ہے کہ دیسنہ کا مغربی حصہ شہنشاہ اکبر کے خالصہ آراضیات میں تھا جسے اکبر نے اس عہد کے راجہ ٹکاری کو اس کے حسن خدمات کے صلہ میں بطور انعام دیدیا تھا، اسی وقت سے اس کا نام اکبر پور پڑ گیا، راجہ ٹکاری کے خاندان میں ابتک عہد اکبری کے فرامین موجود ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو انعام میں بہت سی جاگیریں دی گئیں۔

دیسنہ کا دوسرا مشرقی حصہ پانچ سو بگھہ میں پھیلا ہوا ہے، اور کلیان پور دیسنہ کہلاتا ہے،

اور ایمہ اراضی کے نام سے بھی مشہور ہے، ایمہ اراضی کے نام سے بہت سی آراضیات مشرقی بہار کے مواضعات میں موجود ہیں، یہ ان قطعات زمین کو کہا جاتا ہے جو دہلی کے بادشاہوں نے علما، و مشائخ کو عطا کی تھیں، جو سرکاری اصطلاح میں ائمہ کہلاتے تھے، دیسنہ کی آراضی ائمہ اسی قسم کی ہے، عہد مغلیہ کے آخری دور میں بہار کا صوبہ دار کلیان سنگھ ہوا تو اس نے اسکو اپنے نام سے موسوم کر لیا، تاکہ اس کی یادگار بھی رہ جائے، اور خالصہ آراضی اکبر پور سے تفریق بھی ہو جائے۔

سادات دیسنہ کے مورث اعلیٰ حضرت میر حسن شہید کا نسب نامہ حضرت امام علی رضا سے ملتا ہے، ان کے آباء واجداد مشہد مقدس سے شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے، میر حسن شہید عہد اکبری سے بہت پہلے بہار تشریف لائے اور دیسنہ میں مقیم ہوئے اور عہد اکبری میں جب دین الٰہی کا فتنہ اٹھا تو اس سیاسی اور مذہبی بحران میں میر حسن نے شہادت پائی، اور دیسنہ ہی میں مدفون ہیں، ان کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے سید عثمان دیسنہ ہی میں متوطن رہے، اور ان کی دوسری اولادیں اور مقامات پر منتقل ہو گئیں، سید عثمان کے اکلوتے صاحبزادے میر سید سلیمان تھے، ان کے دو لڑکے تھے، حضرت صدر الدین اور حافظ میر جان محمد، سادات دیسنہ ان ہی دونوں بھائیوں کی نسل سے ہیں، اور جب بہار کے سادات کا عروج ہوا تو حضرت صدر الدین کو ائمہ دیسنہ کے علاوہ اور بھی جاگیر ملی، جس میں سے ایک حصہ انکے چھوٹے بھائی حافظ جان محمد کے نام پر چک جان محمد کے نام سے ابتک مشہور ہے، یہ جاگیر زمینداری کے خاتمہ تک سادات دیسنہ کے قبضہ میں تھی،

سید صاحب کا دادھیالی سلسلہ رضوی اور نانہالی سلسلہ زیدی ہے، اوپر جاکر چوتھی پشت میں دونوں مل جاتے ہیں، دادھیالی سلسلہ حسب ذیل ہے:

سید سلیمان ندوی بن حکیم سید ابوالحسن بن حکیم سید محمد شبیر عرف حکیم محمدی بن میر عظمت علی
ابن میر وجیہ الدین عرف میر جگن بن میر رجب علی بن میر محمد شبیر بن حضرت میر صدر الدین (مورث اعلیٰ
موجودہ آبادیِ موضع دیسنہ) بن میر سید سلیمان بن میر سید عثمان بن سید حسن شہید بن سید شمس الدین
ابن میر سید خلیل بن میر سید عرب ثانی بن میر سید مالک بن میر سید منیر بن میر سید محمد بن میر سید شمس محمد
ابن سید معین محمد بن میر محمد بن سید عرب اول بن سید امیر برآن بن میر سید میران بن میر سید احمد
ابن میر سید محمد بن سید یوسف بن سید اسحاق بن سید یعقوب بن سید حسن بن امام علی رضا بن امام
موسیٰ رضا بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام حسینؓ شہید کربلا ابن
حضرت فاطمہؓ بنت حضرت رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ان کا ننہالی سلسلہ حسب ذیل ہے:

سید سلیمان ندوی بن بی بی قطبن بنت حکیم سید حیدر حسین بن حکیم سید کاظم حسین بن حکیم
سید خادم حسین بن حکیم سید رحمت اللہ بن سید امین اللہ ساکن موضع مسیان مقیم دیسنہ شادی از
دختر میر صدر الدین علیہ الرحمہ بن سید محمد فاضل بن سید غلام حیدر بن سید عبدالہاشم بن سید
عبداللہ بن سید علادل بن سید ملوک بن سید چاند شہید (مزار بر کوہ باربتی مضافات بہار) بن
سید یحییٰ بن سید محمد عرف سید ہیبت بن سید یحییٰ بن سید محمود بن سید زید بن سید مسعود جاجنیری زا غزنولی
ابن سید محمود بن سید بن سید ابوالفرج واسطی بن سید داؤد بن سید حسین بن سید یحییٰ بن سید زید بن
سید عمر بن سید ابا بکر علی بن سید حسین بن سید علی بن سید محمد بن سید ابو یحییٰ عیسیٰ مؤتم الاشبال
ابن امام زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسینؓ شہید کربلا بن حضرت فاطمۃ الزہراؓ
بنت حضرت رسالت مآب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

سید صاحب کے ننہالی سلسلہ میں چار پشت تک طبیب ہوتے رہے، اطراف بہار

میں یہی پہلا خاندان ہے جس میں طبابت کا سلسلہ برسوں جاری رہا، سید صاحب کے نانا اور
میرے دادا حکیم سید حیدر حسین اپنے وقت کے مشہور طبیب تھے، اور اسلام پور ضلع پٹنہ کے
مشہور رئیس چودھری ظہور الحق کے خاندانی معالج تھے، پٹنہ کے مشہور حکیم عبدالحمید صاحب
کو چودھری صاحب نے کسی موقع پر علاج کے لیے بلایا تو انھوں نے حکیم سید حیدر حسین کے
نسخوں کو دیکھ کر فرمایا کہ ان کے ہوتے ہوئے میری ضرورت نہ تھی، ان کے بڑے صاحبزادے
سید ناظر حسن بھی بہت اچھے طبیب تھے لیکن عین عالم شباب ہی میں لاولد وفات پاگئے، اس لیے حکیم حیدر حسین
کے انتقال کے بعد ان کی جگہ سید صاحب کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن صاحب کا تقرر ہوا،
حکیم سید حیدر حسین کے والد حکیم سید کاظم حسین بھی بہت اچھے طبیب شمار کیے جاتے تھے، انکے
والد حکیم سید رحمت اللہ دہلی کے مشہور طبیب حکیم محمد شریف خاں بن حاذق الملک حکیم
محمد اکمل خاں سے فیضیاب ہوئے تھے،

سید صاحب کے دادا حکیم سید محمد شبیر عرف حکیم محمدی کا شمار حاذق اطبا میں ہوتا
تھا، انھوں نے شروع میں طب اپنے نانا حکیم سید خادم حسین اور اپنے ماموں حکیم سید کاظم حسین
سے پڑھی، پھر ۱۲۴۷ھ سے ۱۲۵۱ھ تک پٹنہ میں رہ کر جناب قاضی محمد وحید الدین خاں کے
یہاں رہ کر تکمیل تعلیم کی، طبابت پہلے بہار شریف پھر محلہ گمہہ شیخپورہ ضلع مونگیر میں کی اور وہاں
کے نواب علی خاں کے دربار میں بڑی عزت و وقار کے ساتھ رہے، مزاج شاہانہ تھا، نازک مزاجی
حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی، لیکن اپنے فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اس لیے خاص و عام دونوں
ان کی نازبرداری کرتے تھے، تقریباً چالیس سال تک وہاں مطب کرکے ۱۳۰۳ھ میں وفات
پائی، بادۂ تصوف کے بھی ذوق آشنا تھے، بہار شریف کی درگاہ انبیر شریف کے سجادہ نشین
حضرت شاہ محمد نور قدس سرہ العزیز سے بیعت تھے، اور اسی مناسبت سے تصوف پر ایک

رسالہ نورِ محمدی کے نام سے لکھا تھا، جو چھپ کر شائع ہوگیا ہے، طب پر بھی چند کتابیں لکھیں جن کے نام یہ ہیں، قرابادین محمدی جس کا تاریخی نام مخزن الحکمۃ العلیا، ہے، دستور العلاج یا اصول علاج، یہ دونوں کتابیں حضرت سید صاحب کے والد ماجد کی تعلیم کی خاطر لکھی تھیں، حکیم محمدی شعر و شاعری سے بھی ذوق رکھتے تھے، اور کبھی کبھی مناجات، بزرگانِ دین کی منقبت اور اپنے خاندان کے بزرگوں کی تاریخِ وفات کہا کرتے تھے، انھوں نے اپنا نسب نامہ بھی منظوم کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ پدری سلسلہ میں رضوی اور مادری سلسلہ میں زیدی تھے،

این نسب نامہ جانبِ اور — نظم گویم برائے حفظ پسر

نام اجداد و مادر خود را — از رہ صدق می کنم انشا

رضوی ام بے گماں ز نزد پدر — زیدی ام من ز جانبِ مادر

جدہ ام بنت میر عبداللہ — پس بجاں می کنم شکرِ اللہ

جد امجد طبیب حاذق بود — میر خادم حسین فایق بود

بے شک و شبہ آں مسیح زمن — عالم طب و ماہر ہر فن

میر کاظم حسین اموں جاں — بے گماں بود آں طبیبِ ماں

حکیم محمدی کے چھوٹے بھائی مولوی مصطفےٰ شیر نے جونپور میں مولانا سخاوت علی سے تعلیم پائی، جو مولانا ابوبکر شیث مرحوم سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے جدِ امجد تھے، اسی لیے سید صاحب اور مولانا ابوبکر شیث صاحب کے بڑے گھرے مراسم تھے، اور مولانا مرحوم دیسنہ بھی تشریف لائے تھے، مولوی مصطفےٰ شیر حصول تعلیم کے بعد سہسرام کے عربی مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے اور وہیں وفات پائی،

حکیم محمدی صاحب کے تین صاحبزادے تھے، جن میں سب سے بڑے سید صاحب کے والد ماجد

حکیم سید ابوالحسن صاحب تھے، ان کی شادی حکیم سید حیدر حسین مرحوم کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی جو میری سگی پھوپھی تھیں، پہلے ذکر آچکا ہے کہ حکیم سید حیدر حسین اسلام پور ضلع پٹنہ کے مشہور رئیس چودھری ظہور الحق کے خاندانی معالج تھے، ان کی وفات کے بعد حکیم سید ابوالحسن ان کی جگہ خاندانی طبیب مقرر ہوئے، اور بڑے اعزاز کے ساتھ رہے، ان کی پوری زندگی وہیں گذری اور یہیں حضرت شاہ ولایت علی نقشبندی سے بیعت بھی کی، اور ان کے ساتھ حج کو بھی تشریف لے گئے، لیکن مرشد سے تربیت ابھی پورے طور سے حاصل نہیں کی تھی کہ ان کا وصال ہوگیا، جس سے حکیم صاحب موصوف کی تشنگی باقی رہ گئی، اس لیے کچھ دنوں کے بعد طبیعت میں اضطراب پیدا ہوا، جب یہ کیفیت ناقابل برداشت ہوگئی تو رہبر کی تلاش میں گھر سے پیدل نکل کھڑے ہوئے، بہار شریف کے ہر خانزادہ میں گئے مگر تشفی نہیں ہوئی، جھٹلی شریف اور پٹنہ سیٹی وغیرہ میں ٹھہرے، لیکن وہاں بھی سیری نہیں ہوئی، آخر میں پھلواری شریف کی خانقاہ پہنچے، صبح کا وقت تھا، سائبان میں لوگ بیٹھے تھے، چائے کا دور چل رہا تھا، یہ بھی ایک گوشہ میں جا کر بیٹھ گئے، حضرت شاہ علی حبیب قدس سرہٗ اس وقت سجادہ نشین تھے، انھوں نے اپنے خادم سے کہہ رکھا تھا کہ آج ایک مہمان آنے والے ہیں، وہ جب آجائیں تو اطلاع کرنا، جب کچھ تاخیر ہوئی تو خادم کو بلایا، خادم نے کہا کوئی مہمان ابھی تک نہیں آیا ہے، شاہ صاحب نے تاکید کی کہ باہر جا کر غور سے دیکھو، خادم باہر آیا تو برآمدہ میں ایک نو وارد کو دیکھا جو سید صاحب کے والد ماجد تھے، ان کو ساتھ لیکر شاہ صاحب کے پاس گیا، دونوں میں تخلیہ میں ڈھائی گھنٹے تک راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں، چار دن کے بعد واپسی کا حکم ہوا، اور اسلام پور آکر پوری عمر ریاضت و عبادت میں گذار دی، اور وفات کے بعد اپنے مرشد کے پائیں سپرد خاک ہوئے،

حکیم سید ابو الحسن کے ایک لڑکی اور دو لڑکے تھے، صاحبزادی گاؤں ہی میں سید امیر الحسن ابن میر واعظ شیر بن میر صفدر شیر سے بیاہی گئیں، لیکن شادی کے فوراً ہی بعد بیوہ ہو گئیں، گاؤں کی تعلیم یافتہ خواتین میں ان کا پہلا یا دوسرا درجہ تھا۔

بڑے صاحبزادہ کا اسم شریف سید ابو حبیب تھا، ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، عربی پٹنہ اور پھلواری شریف میں پڑھی، حضرت شاہ عین الحق صاحب خلف شاہ علی حبیب قدس سرہٗ کے ہمدرس تھے، مولانا شاہ نعمت علی صاحب سے حدیث اور پھر طب کی تعلیم پھلواری شریف میں مولانا شاہ سید سلیمان اور حکیم وارث حسن صاحب اور پٹنہ میں حکیم محمد نصیر سے پائی، بھوپال میں حضرت شاہ ابو احمد مجددی سے بیعت تھی، ان کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا، اور کاغذی محلہ بہار شریف میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کے صاحبزادہ مولانا ابو ظفر صاحب ندوی تھے، جو علمی دنیا میں اچھی طرح روشناس ہیں، تین صاحبزادیاں بھی ہیں، ایک سید عبد الباری صاحب اورسیر سے بیاہی گئیں جو اب کراچی میں مقیم ہیں، دوسری مولوی عبد الحفیظ ندوی سے منسوب ہیں جو ریلوے ہائی اسکول کھڑگپور سے ریٹائر ہو کر اب دیسنہ میں مقیم ہیں، تیسری اس حقیر راقم کی رفاقت کر رہی ہیں۔

سید صاحب اپنے بڑے بھائی سے تقریباً ۱۹ سال چھوٹے تھے، گاؤں میں ان کا جدی مکان داؤد مرحوم کے مکان کے نام سے مشہور ہے، لیکن ان کے والد ماجد حکیم سید ابو الحسن نے اپنی شادی کے بعد ایک علیحدہ مکان بنوایا جو اس وقت گاؤں کی مسجد کے پچھم اور شمال میں واقع ہے، اور اس میں آجکل ان کے خاندانی خادموں کا خاندان آباد ہے، یہیں سید صاحب کی ولادت ہوئی، ان کے والد نے ان کا نام ابو نجیب رکھا، لیکن ان کے منجھلے چچا سید ابو تراب مرحوم نے سلیمان اعظم رکھا، اور وہ سلیمان ہی کے نام سے پکارے گئے۔

سید صاحب نے اردو کی تعلیم اپنی ہمشیرہ سے پائی، وہ شروع سے کم آمیز تھے، اور

گاؤں کے ہمسن لڑکوں سے بہت کم ملتے تھے، گاؤں میں ایک زندہ دل بزرگ مولوی محمد یسین جو یسین چچا کے نام سے مشہور تھے ایک لڑکے محمد حنیف کو پڑھایا کرتے تھے، سید صاحب کچھ دنوں محمد حنیف ہی کے ساتھ ان کے پاس بھی بٹھائے گئے اور پارۂ عم کی کچھ سورتیں ان سے پڑھیں لیکن جلد مولوی مقصود علی صاحب ساکن موضع اوکھدی ضلع پٹنہ خاص طور پر سید صاحب کی تعلیم کے لیے بلائے گئے۔ ان کے آنے کے بعد ایک مکتب قائم ہوا، جس میں میرے علاوہ سید مظاہر حسن مرحوم (حافظ) عبد الصمد مرحوم، محمد حنیف (مختار مرحوم)، ملک رشید الحق، توحید شاہ کے بڑے بھائی عبد القادر اور دو ہندو سنار کے لڑکے شریک ہوئے، یہ مکتب جہاں قائم ہوا تھا، وہ اس وقت صغیر مرحوم کا دروازہ کہلاتا تھا، صغیر مرحوم مولانا ابو ظفر ندوی کے چھوٹے ماموں تھے، سید صاحب نے کلام مجید مولوی مقصود علی صاحب ہی سے ختم کیا، اور فارسی شروع کی، ان کے ساتھ میں بھی آمد نامہ، کریما، نسخہ تعلیمیہ، گفتگو نامہ اور گلستاں باب اول و دوم پڑھتا رہا، ہم لوگوں کی تعلیم اس مکتب میں غالباً دو ڈھائی سال رہی، سید صاحب اپنے ہم مکتبوں سے نہ بے تکلفی سے ملتے اور نہ ہمارے کھیلوں میں شرکت کرتے، ہم لوگ چندہ کر کے کوئی چیز پکاتے تو چندے میں تو شریک ہو جاتے، لیکن چیزوں کی فراہمی میں دوڑ دھوپ کرنا پسند نہ کرتے تھے، البتہ گاؤں کی ندی میں جب کبڈی ہوتی تو اس میں شریک ہو جاتے، اور کبڈی اچھی کھیلتے تھے، کبھی کبھی ہم لوگ کوئی تمثیلی ڈرامہ کرتے تو اس میں بھی وہ شریک ہوتے اور ہم لوگ ان کو ہیرو کا پارٹ دیتے۔

سید صاحب کے بڑے بھائی حکیم سید ابو حبیب جب تعلیم پا کر دیسنہ تشریف لائے، اور یہاں مطب شروع کیا تو ہم دونوں نے ان سے گلستاں باب ہشتم، بوستاں، یوسف زلیخا اور رقعات عالمگیر وغیرہ پڑھیں، پھر عربی شروع کی، اور میزان، منشعب، پنج گنج، زبدہ، صرف میر، فصول اکبری اور نحو میں شرح ملا جامی تک پڑھی، منطق میں کبری، میزان منطق اور تہذیب تک

تعلیم پائی، اس درس میں ہم لوگوں کے ہم وطن مولانا محمد قاسم بن حافظ شاہ مولانا تجمل حسین خلیفہ مجاز مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی بھی شریک ہوتے تھے، میرا زیادہ وقت جناب حکیم سید ابوحبیب کے گھر ہی پر گذرتا، میری پھوپھی یعنی سید صاحب کی والدہ مجھ سے گھر کا جو کام بھی لیتیں میں بلاتکلف کر دیتا، کبھی چارپائی بنی جاتی تو میں بھی شریک ہوجاتا، سید صاحب کو ان کاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، ان کی والدہ اور ہمشیرہ ان پر خفا ہوتیں تو وہ کہتے کہ نجم الہدیٰ آپ لوگوں کا پلنگ بن دیتے ہیں، اس لیے وہ اچھے ہیں، میں نہیں بنتا اس لیے برا ہوں،

اسی زمانہ میں مولوی حکیم سید ابوحبیب کو اپنے گاؤں کی عورتوں کی معاشرتی اصلاح کا خیال ہوا، ان میں بہت بری رسمیں اور بدعتیں رائج تھیں، حکیم صاحب عورتوں کو ہفتہ میں دو روز اپنے گھر بلاکر ان کی تربیت و اصلاح فرماتے، اور رمضان شریف میں پند و نصیحت کا سلسلہ روزانہ جاری رہتا، اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ میں یا سید صاحب حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان کی قرأت کرتے، اور حکیم صاحب اس کا مطلب بیان کرتے، اور موقع موقع سے قرآن شریف کے احکام اوامر و نواہی بھی سناتے جاتے، یہ سلسلہ گیارہ بجے دن تک رہتا، اسی سے میرے اور سید صاحب کے عقائد میں پختگی کی بنیاد پڑی، جس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں محرم میں امام باڑہ اور تعزیہ داری کے تماشوں سے پرہیز کرنے لگے، اور جو لوگ اس میں شریک ہوتے تھے، ان کے خلاف ہم دونوں نے ایک تحریر مرتب کی ....

اور اس کو لفافوں میں بند کرکے ان لوگوں کے پاس بھجوادیا، تعزیہ اور سہرا بنانے والوں میں ہم دونوں کے بزرگ بھی تھے، ان بزرگوں کو یہ تحریک ناگوار گذری، چونکہ میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اس لیے میں ان کی عدالت میں حاضر کیا گیا، اور یہ سزا تجویز کی گئی کہ پچیس بار کان پکڑ کر اٹھوں بیٹھوں، اسی کے بعد میں ایک شریر لڑکے کی حیثیت سے مشہور ہوا، اور سید صاحب بدستور نیک لڑکوں

ہی میں شمار ہوتے رہے۔

حکیم سید ابوحبیب صاحب کچھ دنوں کے لیے اپنے پیر و مرشد کے یہاں بھوپال تشریف لے گئے تو ہم دونوں نے مولانا سید بشارت کریم سے پڑھنا شروع کیا، یہ میرے ہم زلف عبدالباری کے والد ماجد تھے، اور اس زمانہ میں استھانواں میں حافظ ملک شرف الدین کو حدیث شریف کا دور کرا رہے تھے، ہم دونوں روزانہ صبح کے وقت استھانواں جاتے اور سبق لے کر واپس آتے تھے، استھانواں دیسنہ سے ایک میل کی مسافت پر ہے، جب بھوپال سے حکیم صاحب واپس آگئے تو پھر ہم لوگ ان سے درس لینے لگے، ان ہی کے ساتھ ہم لوگ ظہر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے، جہاں نماز کے بعد اخبار وکیل امرتسر پڑھا جاتا اور گاؤں کے لوگ دلچسپی سے سنتے، اس زمانہ میں سرسید احمد خاں کی مخالفت میں پرزور مضامین نکل رہے تھے، ان مضامین سے مجھکو تو کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی لیکن سید صاحب غور سے سنتے۔

۱۸۹۷ء کے آخر یا ۱۸۹۸ء کے اوائل میں حکیم صاحب حج کے لیے تشریف لے گئے، اس وقت ہم دونوں کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا، سید صاحب کو ان کے والد اپنے ساتھ اسلام پور لے گئے اور چھ مہینے اپنے ساتھ رکھا، وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے بزرگ تھے، ان کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے میں بڑا وقار ہوتا، اس لیے ہم لوگ جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ان کے سامنے بڑے ادب سے بیٹھتے، وہ کوئی سوال کرتے تو جواب دیتے وقت بڑی سنجیدگی اختیار کرنی پڑتی، جب وہ اسلام پور سے دیسنہ تشریف لاتے تو ہم دونوں کو ان کے ساتھ دسترخوان پر شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوتی، کھانے میں ہم لوگوں کے منہ سے آواز نکلتی تو فرماتے کہ انسان اس طرح نہیں کھاتے، کتے اور بلی اس طرح کھاتے ہیں، سید صاحب کی آواز ہمیشہ سے پست اور دھیمی تھی، ایک بار حکیم صاحب نے ان سے کچھ پوچھا

تو حسب معمول بہت ہی دھیمی آواز میں جواب دیا، جس کو حکیم صاحب نے نہیں سمجھا، اس لیے پھر پوچھا، سید صاحب نے پھر اسی آواز میں جواب دیا، حکیم صاحب نے جھلا کر کہا "منہ سے آواز کیوں نہیں نکلتی، جی چاہتا ہے کہ تمھارا منہ نوچ لیا جائے،" اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد انجمن الاصلاح دیسنہ کا سالانہ جلسہ تھا، جس کی صدارت حکیم صاحب فرما رہے تھے، اس موقع پر سید صاحب نے بھی تقریر کی جو سامعین نے پسند کی، اس تقریر کو سنکر حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا کہ ابو نجیب کو بولنا بھی آتا ہے۔

حکیم صاحب سید صاحب کو تعلیم کے لیے اسلام پور سے پھلواری شریف لے گئے، پھر مجھ کو بھی پھلواری پہنچا دیا، وہاں میر عابد حسین کے یہاں میرے قیام کا انتظام تھا، اور سید صاحب خانقاہ کی ایک کوٹھری میں مقیم تھے، میری قیام گاہ کے متصل حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کا مکان تھا، اور ان کے صاحبزادوں سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، پھلواری شریف سے ہم لوگوں کو پرانا قلبی تعلق تھا، سید صاحب کے والد ماجد نے حضرت شاہ علی حبیب سے فیوض حاصل کیے، میرے بزرگوں کو بھی اسی خانوادہ سے عقیدت و بیعت تھی، اس لیے یہاں ہم لوگوں کو اجنبیت محسوس نہیں ہوئی، ہماری تعلیم حضرت استاذی مولانا شاہ محی الدین کے سپرد ہوئی، وہاں کے مدرسہ میں اس وقت مولانا عبد الرحمٰن کاکوی صدر مدرس تھے، جو مولانا شاہ محی الدین کو حدیث کا درس دیا کرتے تھے، ان کے ہم درس مولانا شاہ معین الدین مرحوم، جناب شاہ محمد خلیل، جناب شاہ حکیم محمد شعیب، جناب حکیم عبد المنان صاحب، جناب مولانا رحیم بخش صاحب آروی بانی مدرسہ فیض الغرباء آرہ، اور جناب حافظ محمد وصی صاحب ساکن ہزاری باغ بھی تھے، یہ حضرات طلبہ کو شوقیہ درس بھی دیتے تھے، ہم اور سید صاحب دیسنہ سے قدوری اور تہذیب پڑھ کر آئے تھے، پھلواری پہنچکر شرح وقایہ اور تہذیب شروع کی، مولانا رحیم بخش منطق بہت اچھی

پڑھاتے تھے، وہ تہذیب پڑھاتے تو پوری طرح ذہن نشین کرا دیتے، اور ان ہی کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب میں ندوہ میں داخل ہوا تو منطق کے درس میں ہمیشہ ممتاز رہا، مولانا شاہ معین الدینؒ مرحوم سے شرح وقایہ پڑھی، سید صاحب پھلواری کے قیام میں حسب معمول طلبہ سے کم ملتے جلتے تھے، ان کے مزاج میں شروع ہی سے تحمل، بردباری اور عفو و درگذر کا مادہ تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا، پھلواری کے مدرسہ میں جہان آباد ضلع گیا کا ایک لڑکا پڑھتا تھا، ۱۲ ربیع الاول کے عرس کے موقع پر اس نے دھوکا دے کر ہم دونوں سے کچھ نقد وصول کر لیا، اس کے بعد سید صاحب سے اس کی ملاقات ہوئی تو نادم ہونے کے بجائے ان سے لڑنے لگا، میں بھی اتفاق سے وہاں پہنچ گیا، سید صاحب جیسے جیسے نرم ہوتے جاتے ویسے ہی وہ گرم ہوتا جاتا، میں نے اس کو سختی سے جواب دیا، وہ کچھ ہاتھا پائی پر اتر آیا، اور میں مغلوب ہو گیا، سید صاحب کھڑے تماشا دیکھتے رہے، اور انھوں نے میری کوئی مدد نہیں کی، جب وہ لڑکا چلا گیا تو میں ان پر بہت برہم ہوا کہ تمھاری خاطر تو میں لڑ رہا اور تم نے کوئی مدد نہیں کی، جب میں زیادہ بگڑا تو بولے میں نے تم سے کب کہا تھا تم میری مدد کے لیے اس سے جھگڑا کرو، وہ خود ہی بولتے بولتے خاموش ہو جاتا اور اس کی نوبت ہی نہیں آتی،

سید صاحب کا زیادہ وقت مولانا شاہ محی الدینؒ کی صحبت میں گزرتا، یا پھر کوئی اردو کی کتاب پڑھتے، مولانا عبد الحلیم شرر کا کوئی تاریخی ناول ان کو مل جاتا، تو اس کو شروع سے آخر تک پڑھ جاتے، سید صاحب کی کوٹھری کے پاس ہی ایک بزرگ مولوی عبد اللہ رہتے تھے، ان کے چھوٹے بھائی مولوی محمد معشوق صاحب شاعر تھے، ان کے کمرہ میں شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا، سید صاحب اس مجلس میں ضرور شریک ہوتے، خانقاہ میں قوالی کی محفلیں برابر ہوتی رہتیں، سید صاحب ان میں بھی شوق سے شرکت کرتے، ان کو شعر و سخن سے فطری

لگاؤ تھا، مگر اس پر جلا پھلواری شریف کے قیام میں ہوئی،

اسی زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا شاہ منور علی نے مرشد کی ہدایت سے دربھنگہ میں ایک مدرسہ کھولا تھا، جس کا نام مدرسہ امدادیہ تھا، تھوڑے دنوں میں اس کی شہرت پھیل گئی، اس لیے ہم دونوں کو ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف سے دربھنگہ بھیجدیا گیا، یہاں ہمارا قیام عم محترم سید امیر حسن کے یہاں تھا، جو عم محترم سید رحیم الدین مالک و اڈیٹر اخبار الپنچ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، اسی مدرسہ میں ہم دونوں نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب دیوبندی سے ہدایہ جلد اول اور مولانا فدا حسین صاحب آروی سے تہذیب پڑھی، مدرسہ میں ہر ہفتہ مجلسِ مکالمہ بھی منعقد ہوتی تھی، طلبہ کو ایک ہفتہ پہلے کوئی عنوان دیدیا جاتا جس پر وہ مضمون لکھتے یا تقریر کرتے، داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں ہم لوگوں کو اس میں شرکت کا موقع ملا، اور عنوان "وقت کی قدر و قیمت" دیا گیا، گھر آکر ہم دونوں نے اس موضوع پر مضمون لکھنا شروع کیا، مگر میں مشکل سے دو صفحے لکھ سکا، اور سید صاحب نے اتنی ہی دیر میں چار پانچ صفحے لکھ ڈالے، اور اس کو مجلس مکالمہ میں پڑھا جس کی بڑی تعریف کی گئی، اور بعد میں یہ مضمون رسالہ مخزن میں شائع ہوا، جو اس وقت شیخ عبد القادر کی ادارت میں نکلتا تھا،

۱۹۰۰ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا سالانہ جلسہ پٹنہ میں منعقد ہوا، اس میں قدیم اور جدید تعلیم یافتہ جماعتوں کے افراد بڑے شوق سے شریک ہوئے، پنڈال میں بڑی شان و شوکت نظر آتی تھی، اور قدیم و جدید دونوں گروہوں کے تعاون کا بڑا دلکش اور موثر منظر تھا، صوبہ بہار کے اکثر علماء اس میں شریک تھے، ممتاز بیرسٹروں اور وکیلوں کی جماعت بھی تھی، بڑی دلپذیر تقریریں ہوئیں جن سے متاثر ہوکر سید صاحبؒ کے والد ماجد نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں کو تعلیم کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء بھیجدیں، چنانچہ ہم لوگ برادر محترم سید محمد احسن مرحوم استھانوی کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہوئے،

سید محمد احسن صاحب سید صاحبؒ کے پھوپھی زاد اور میرے چچازاد بھائی تھے، وہ اس زمانہ میں لکھنؤ میں طب کی تعلیم پا رہے تھے، اور مولانا شاہ محمد علی مونگیریؒ خلیفہ جناب مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے ان کے تعلقات تھے، مولانا محمد علی مونگیریؒ کی نظامت ندوۃ العلماء سے پہلے ان کی نگرانی میں سید محمد احسن صاحب، تحفہ محمدیہ کانپور سے ایک رسالہ نکالتے تھے، جس میں اسلام پر عیسائیوں اور آریوں کے اعتراضات کے جوابات دیے جاتے تھے، سید محمد احسن صاحب عزیزی محمد ہاشم ندوی سابق ناظم دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کے والد ماجد تھے،

ہم دونوں ۱۹۰۱ء کے آغاز میں لکھنؤ پہنچے، ہم سے پہلے ہمارے دو ہم وطن اور اعزہ مولانا عبد السبحان بن حاجی شاہ سید محمد اسمٰعیل انسپکٹر پولیس اور مولانا محمد قاسم بن مولانا شاہ حافظ سید تجمل حسین خلیفہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ ندوہ پہنچ چکے تھے، مولانا عبد السبحان مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی کے ساتھ رہتے تھے، جو ان کے والد ماجد کے مرشد جناب شاہ محمد کامل صاحبؒ ولید پوری کے قریبی عزیز تھے، مولانا قاسم کے والد ماجد مولانا محمد علی مونگیریؒ کے پیر بھائی تھے، اس لیے ندوہ سے ان کو گھر لگاؤ رہا، اور انھوں نے اپنے لڑکے کو یہاں داخل کیا تھا، ہم دونوں کا داخلہ ندوہ میں ہوا تو مولانا قاسم کے کمرہ ہی میں جگہ ملی،

ہم لوگ دار العلوم کی دوسری جماعت میں داخل ہوئے، جس میں مولانا عبد السبحان اور مولانا قاسم پہلے سے تھے، اسوقت دار العلوم میں کل چار درجے کھلے تھے، پہلے درجہ میں صرف، نحو اور حساب کی تعلیم ہوتی تھی، جو مولوی حبیب الدین مرحوم کے سپرد تھی، دوسرے درجہ میں صرف و نحو کی آخری کتابیں، فقہ، فرائض، منطق اور حساب کی تعلیم ہوتی تھی، تیسرے میں فقہ او منطق کے علاوہ ادب اور فلسفہ بھی تھا، یہ دونوں درجے مفتی عبد اللطیف سے متعلق تھے، چوتھے درجہ میں منطق، فلسفہ اور ادب کے ساتھ حدیث پڑھائی جاتی، اس کے اسباق شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ صاحبؒ کے ذمہ تھے، اس وقت دوسرے درجہ میں سب سے زیادہ لڑکے تھے،

ان میں کچھ طلبہ کے نام یاد ہیں، خاکسار، سید سلیمان، سید محمد قاسم دلیسنوی، سید عبد السبحان دیسنوی کے علاوہ ظہور احمد شاہجہانپوری مرحوم، انجم مانپوری، گیاوی (صاحب طنزیات مانپوری) محمد مبین خلف ثانی مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، حبیب الزمان خاں شاہجہانپوری خلف مولانا محمد مسیح الزماں خاں قائمقام ناظم ندوہ وغیرہ تھے،

چاروں درجے کے ادب کی تعلیم مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے متعلق تھی، اس کے علاوہ تعلیم کی نگرانی بھی ان ہی کے ذمہ تھی، داخلہ کے سال اول میں میرا اور سید صاحب دونوں کا معمولی طالبعلموں میں شمار رہا، سید صاحب کو حساب سے مطلق دلچسپی نہ تھی، اس لیے وہ مجھ سے بھی فروتر سمجھے جاتے تھے، استاذی مفتی عبد اللطیف ہر سنیچر کو اور ہم سے اوپر والی جماعت کے درمیان منطق یا فلسفہ کے کسی مسئلہ پر مباحثہ کراتے، اس میں کبھی کبھی مولانا محمد حفیظ اللہ مدرس اول اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی بھی شرکت فرماتے، مناظرانہ گفتگو کرنے میں میری طبیعت بہت لگتی تھی، پھلواری شریف کے قیام کے زمانہ میں مولانا رحیم بخش آروی کے درس میں اس کی مشق بھی پیدا ہوگئی، اور ان ہی کے ذریعہ مجھکو بہت سی مناظرانہ اصطلاحات سے واقفیت ہوگئی تھی، مثلاً "تحصیل حاصل محال ہے، دعویٰ بلا دلیل قابل حجت نہیں ہوتا، مخالف اور منکر پر بار ثبوت نہیں، کسی مجہول شے کی تعریف مجہول امور سے نہیں ہوسکتی، مسلمات اور بدیہیات سے انکار علمیت کے خلاف ہے، اسی لیے میں مباحثے اور مناظرے میں زیادہ حصہ لیتا اور نمایاں رہتا،

شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دار العلوم میری باتوں سے بہت خوش ہوتے، ۸ر شعبان ۱۳۱۹ھ میں ندوہ کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہوا، اس میں شریک ہونے کے لیے دار العلوم سے ہر درجہ سے ایک ایک طالب علم کا انتخاب ہوا، میرے درجہ سے مولانا حفیظ اللہ صاحب کی تحریک سے میرا انتخاب ہوا، حالانکہ میں حقیقۃً اس کا مستحق نہیں تھا، تحریری اور علمی لیاقت کی بنا پر سید صاحب یا ظہور احمد شاہجہانپوری کا انتخاب ہونا چاہیے تھا،

فروری ۱۹۰۲ء مطابق شوال ۱۳۱۹ھ میں جب ہم دونوں ترقی پاکر سال سوم میں پہنچے تو سید صاحب نے بال و پر نکالے، اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے گھنٹہ میں جس میں عروض اور ادب کا درس ہوتا تھا، وہ نمایاں رہنے لگے، قصیدہ بردہ اور دیوان ابو العتاہیہ کے اسباق میں جب کوئی نیا محاورہ یا فعل آجاتا جس کے مختلف صلات سے معنی میں تبدیلی ہوتی، تو درس کے بعد مولانا ان محاورات اور افعال کی مختلف طریقوں سے مشق کراتے، کبھی اردو فقرے عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے دیتے جس میں ان افعال اور محاورات کا استعمال ہوتا، کبھی اپنی طرف سے عربی جملے اردو میں ترجمہ کرنے کو کہتے، اس طرح نئے عربی محاورات اور افعال کی مشق کراتے رہتے، میری کاپی بھر جاتی تو اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا، مگر سید صاحب اس کو ضائع نہ کرتے، اور مولانا چریاکوٹی کی بتائی ہوئی باتوں کو یاد رکھتے، مولانا شبلی کے سفرنامہ کے آخر میں جدید عربی الفاظ کا جو فرہنگ شامل ہے، سید صاحب نے اس کو بھی یاد کرلیا تھا، اور لغت کی مدد سے ان کو حل کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی کے مصر سے جو اخبارات ندوہ میں آتے تھے، ان کو آسانی سے سمجھ لیتے تھے،

ہم لوگ جب متوسط درجہ میں آئے تو مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک نظم عربی میں شائع ہوئی جس کے بارے میں غیر معمولی فصاحت اور بلاغت کا دعویٰ تھا، سید صاحب نے اس نظم کو مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے سامنے پیش کیا، انھوں نے اس کی تمام ادبی خامیوں بلکہ معائب کو اچھی طرح واضح کردیا، مولانا اشعار جاہلیت اور کلام پاک کی آیتوں سے عربی کے طرز بیان، طرز ادا، موقع شناسی اور مخاطب کی صلاحیت کے موافق طرز کلام کی نوعیت کو سمجھاتے اور اس کا فرق بتاتے، سید صاحب مولانا چریاکوٹی کے ایک ایک حرف کو لکھ لیتے اور فرصت کے اوقات میں دیکھا کرتے، مگر دوسرے طلبہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی،

اس زمانہ میں ندوہ میں مشہور شاعر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل کے صاحبزادے محمد صدیق صاحب

بھی تھے، ان کا ذوق بھی ادبی تھا، اور وہ بھی سید صاحب ہی کی طرح خاموش اور الگ تھلگ رہنے والے طالب علم تھے، سید صاحب نے ان کو اپنا ہم مذاق پایا، تو ان سے ان کے تعلقات ہو گئے، وہ اپنے والد ماجد کی وساطت سے سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ کے یہاں آتے جاتے رہتے، سید صاحب بھی ان کے ساتھ ان کے یہاں آنے جانے لگے، اس زمانہ میں اودھ پنچ کے آخر میں بطور ضمیمہ آزاد اخبار بھی شامل رہتا تھا، جس میں خبریں ہوتی تھیں، سید صاحب عربی اخباروں کی خبریں ترجمہ کر کے اس ضمیمہ میں کچھ دنوں تک دیتے رہے، اسی زمانہ میں مولانا عبد العلی صاحب آسی مالک اصح المطابع کے لائق شاگرد مولانا عبد اللہ عمادی عربی میں ایک ماہانہ رسالہ البیان نکالتے تھے، سید صاحب نے اس میں بھی مضامین لکھنا شروع کیے، اس سے سید صاحب کی ادبی اور علمی صلاحیتیں تو ظاہر ہونے لگیں، لیکن اپنے درجہ میں بہت زیادہ ممتاز نہ تھے، سال دوم میں مفتی عبد اللطیف صاحب نے منطق شروع کرائی تو منطق کی پہلی کتاب کبری کا درس اپنے سامنے مجھ سے دلواتے، اور جہاں میں رکتا یا طلبہ کو مطمئن نہ کر پاتا تو مفتی صاحب تقریر شروع کر دیتے، علم الفرائض میں بھی سید صاحب کچھ اچھے نہ تھے، بلکہ یہ خاکسار ان سے بہتر سمجھا جاتا تھا، لیکن قدرت کو ان سے بہت بڑا کام لینا تھا، اس لیے ان کی ادبی صلاحیتیں آہستہ آہستہ ابھریں۔

استاذی مولانا مفتی عبد اللطیف تعلیم و تربیت کے معاملہ میں بہت سخت تھے، تمام طلبہ ان سے گھبراتے تھے، وہ بے ضابطگی اور عدول حکمی پر بڑی سخت سزا دیتے تھے، ندوہ کے باہر قریب ہی ایک مسجد تھی جس میں طلبہ نماز پنجگانہ پڑھتے تھے، فجر کی نماز میں جو لڑکا غیر حاضر رہتا، اس کو دوپہر کے کھانے میں گوشت کا پیالہ نہ ملتا، اور دال روٹی ہی پر قناعت کرنی پڑتی، سید صاحب رات کو دیر تک مطالعہ کرتے رہتے تھے، اس لیے فجر کی نماز کے وقت ان کی آنکھ نہ کھلتی اور ان کو اکثر دال روٹی پر قناعت کرنی پڑتی، وہ دن کو بھی سو جاتے تو مشکل سے اٹھتے تھے، ان میں پھرتی مطلق نہ تھی، کھانے کی گھنٹی سننے کے بعد بھی دسترخوان پر دیر کر کے پہنچتے، درجہ میں بھی کبھی وقت پر نہ آتے، مفتی عبد اللطیف صاحب نے شروع میں تو سختی کی، لیکن

جب ان کو اس کا اندازہ ہو گیا کہ وہ قصداً دیر کر کے نہیں آتے بلکہ ان کے مزاج ہی میں سستی ہے تو پھر چشم پوشی کرنے لگے، لیکن طلبہ ان کو "پوستی" کہا کرتے تھے، یہ ہماری اصطلاح ہے جو افیونیوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی جن طلبہ کی طرف مائل ہوتے ان کو انکی طبیعت کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی لقب ان کو دیدیتے، سید صاحب کو "قیس" کہا کرتے تھے، ظہور احمد شاہجہانپوری بہت لاغر اور دبلے تھے اس لیے ان کو "ناحل" کہتے، میں ذرا موٹا تازہ اور چلبلا تھا، اس لیے مجھکو چنگیز خاں کہتے تھے،

۱۹۰۲ء میں ہم دونوں چہارم یعنی متوسط اول میں آئے تو عربی ادب میں سب سے اچھے سید صاحب ہی سمجھے جانے لگے، ان کے بعد ظہور احمد شاہجہانپوری تھے، مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی سید صاحب پر بہت شفقت کرتے تھے، اور سید صاحب بھی ان کے مشورے کے مطابق ادب کی کتابوں کا مطالعہ بڑی محنت سے کرتے تھے، ان کے اسی ذوق کی بنا پر ان کو دار الاخبار کا ناظم بنایا گیا، اس زمانہ میں وہ عربی اخبارات کا گہرا مطالعہ کرتے رہے، جس سے عربی زبان میں ان کی صلاحیت اور زیادہ بڑھی، عربی ادب کے مطالعہ سے اردو ادب میں بھی ان کا ذوق نکھرنے لگا، دار العلوم میں طلبہ اکثر مشاعرہ کرتے تھے، جس میں رکن الدین دانا سہسرامی، تجمل حسین شاہجہانپوری، ظہور احمد شاہجہانپوری، مصطفےٰ خاں ملیح آبادی، عبد الغفور شرر، سید محمد عثمان گیلانی اور عبد السلام اعظمی کے ساتھ سید صاحب بھی اپنا طرحی اور غیر طرحی کلام سناتے، مگر ہم لوگ محض سامعین میں رہتے،

اسی سال جناب شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی اشاعت اسلام کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے اور دار العلوم ہی میں قیام فرمایا، ان کے ساتھ ان کے بڑے صاحبزادے حسن میاں مرحوم بھی تھے، جن سے سید صاحب کی بڑی بے تکلفی ہو گئی، حافظ شاہ تجمل حسین دسنوی بھی دار العلوم کی عمارتوں کی تعمیر کے سلسلہ میں مقیم تھے، اور اکثر دونوں بزرگوں کے ساتھ مولانا حفیظ اللہ کی بھی نشست ہوتی، ان تینوں کی گفتگوئیں ہم لوگ بہت دلچسپی سے سنتے، اس زمانہ میں تقریباً ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی معزز شخص دار العلوم آتا اور

طلبہ کا امتحان لیتا رہتا، مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی طلبہ کو پیش کرتے، اور معزز مہمان طلبہ سے سوال کرتے
تو مولانا اس کو اس طرح دہراتے کہ سوال کا جواب معلوم ہو جاتا، اسی زمانہ میں نواب محسن الملک دار العلوم
تشریف لائے، طلبہ سے عربی اخبارات پڑھوا کر امتحان لیا، اس میں سید صاحب اول آئے، انھوں نے نواب صاحب
کی مدح میں اپنا ایک عربی قصیدہ بھی پڑھ کر سنایا جس سے نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، شاہ
سلیمان پھلواروی نے خوش ہو کر فرمایا کہ ان شاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان بہار کی سرزمین میں علم اور دین
کی خدمت کے لیے موجود رہے گا، یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی،

۱۹۰۳ء ہی میں مفتی عبد اللطیف ندوہ سے مستعفی ہو کر مولانا شاہ محمد علی صاحبؒ کے پاس مونگیر چلے گئے
اور ان کی جگہ مولانا محمد شبلی مدرس تشریف لائے، اس جدید انتظام میں حکیم مولانا سید عبد الحی صاحب معتمد اصلاحات،
منشی احتشام علی صاحب معتمد مال، مولانا فتح محمد صاحب معتمد تعلیم نامزد ہوئے، مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اول اور مہتمم
ہوئے، وہ اپنے متعلقین کے ساتھ ندوہ سے باہر رہتے تھے، اس لیے مولانا فتح محمد صاحب نے طلبہ کی
نگرانی کے لیے اپنے ایک عزیز کو اتالیق مقرر کیا جو پولیس کی ملازمت ختم کر کے پنشن پاتے تھے،
ان کا برتاؤ طلبہ کے ساتھ بالکل پولیس والوں کا جیسا تھا، طلبہ ان سے بے حد خفا رہتے، اور یہ زمانہ
طلبہ کی معاشرتی حالت کے لحاظ سے بھی بہت خراب رہا، سرکس اور تھیٹر جاتے، شطرنج اور تاش کھیلنے
کی وبا عام ہو گئی تھی، لیکن سید صاحب ان سب لغویتوں سے پاک و صاف رہے، اور سب سے
الگ تھلگ کتب بینی میں مصروف رہتے، طلبہ کے قضیوں اور جھگڑوں سے انکو کوئی سروکار نہ تھا،

۱۹۰۴ء میں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی ندوہ سے چلے گئے، تو سید صاحب پر کچھ دنوں تک ان کی
علحدگی کا بڑا اثر رہا، لیکن مولانا نے ادب کا جو ذوق ان میں پیدا کیا تھا اس کی آبیاری وہ برابر کرتے رہے
اور اسی سال وہ انجمن المعین کے مستقل ناظم مقرر ہو گئے، اور میں محاسب مقرر کیا گیا، ان عہدوں پر
ہم دونوں تکمیل تعلیم تک برابر رہے،

اسی زمانہ میں ہم لوگ شہر جاتے تو قیصر باغ کے چوراہے پر ایک پادری صاحب کو اکثر وعظ کہتے
ہوئے پاتے، سید صاحب کو ان سے ملنے جلنے کا موقع ملا، انھوں نے ان کو ایک عمدہ مجلد انجیل دی،
سید صاحب نے اس کا مطالعہ کیا جس سے ان کو غیر مذاہب سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا،
ایک روز ہم لوگوں نے ایک اشتہار دیکھا کہ پادری جوالا پرشاد صاحب کرسچین اسکول میں حسب ذیل تین
عنوانات پر لکچر دیں گے، ضرورت مذہب، موازنۂ مذاہب، عیسائی مذہب کی برتری اور فوقیت،
ندوہ کے طلبہ کی ایک جماعت پہلے دن لکچر میں شریک ہوئی، جس میں ہم دونوں کے علاوہ ضیاء الحسن
علوی اور عبد الباری صاحب بھی تھے، جب پادری صاحب نے لکچر دینا شروع کیا تو ہم لوگوں نے
ان پر اعتراضات شروع کیے، وہ بڑے حلم و انکسار سے جواب دیتے لیکن تشفی بخش نہ ہوتے،
دوسرے دن ہم لوگ پھر پہنچے، موضوع موازنہ مذاہب تھا، سید صاحب نے پادری صاحب کے
سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اسلام پر آدھ گھنٹہ تک اعتراض کریں اور آدھ گھنٹہ اس کا جواب
دینے کے لیے ان کو وقت دیا جائے، پادری صاحب نے اس کو منظور نہیں کیا، اور پانچ منٹ کا وقت
دیا، سید صاحب نے جوابی تقریر میں کہا کہ مذہب وہی قابل قبول ہو سکتا ہے جس کے احکام
فطرت انسانی کے مطابق ہوں، نہ اس قدر سخت ہوں کہ انسان ان کا متحمل نہ ہو سکے، اور
نہ ایسے نرم و آسان ہوں کہ ان کو انسان ناقابل اعتناء سمجھے، مثلاً عیسائی مذہب کی تعلیم ہے کہ
اگر تمھارے ایک گال پر کوئی طمانچہ رسید کرے تو دوسرا گال بھی پیش کر دو، یا تم سے کوئی عبا مانگے
تو تم اپنی چادر بھی اس کو دیدو، یا ایسے تمام لذائذ کو جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لیے مباح
اور جائز قرار دیا ہے، چھوڑ کر رہبانیت اختیار کرو، یا کنفشن کا یہ اصول ہے کہ اگر کوئی مرتے وقت
پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لے تو وہ بالکل معصوم ہو جاتا ہے، کس طرح صحیح ہو سکتا ہے،
عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے کو مصلوب کرا کے اپنی امت کے گناہوں کا کفارہ بن گئے،

انسان کو جرائم اور معاصی کے ارتکاب پر دلیر اور نڈر کر دیتا ہے۔ سید صاحب نے ان باتوں کو کچھ ایسے مؤثر اور باوقار طریقہ پر پیش کیا کہ حاضرین ان کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے، اور پھر پادری صاحب کا رنگ کچھ ایسا اکھڑا کہ وہ تیسرے دن لکچر دینے پر آمادہ نہیں ہوئے،

سید صاحب نے شروع سے خالص عربی تعلیم پائی تھی لیکن گفتگو کرنے، ملنے جلنے، تقریر کرنے اور لکھنے لکھانے میں ان کا وہ انداز نہ تھا، جو عربی کے طلبہ کا عام طور سے ہوتا ہے، اس کی ایک وجہ تو ان کی فطری صلاحیتیں تھیں، دوسرا بڑا سبب ان کے وطن کا ماحول تھا، گاؤں میں صرف ہم چند لڑکوں نے عربی کی تعلیم پائی تھی، ورنہ ہمارے تمام اعزہ اور ہم وطن انگریزی پڑھتے تھے، ہم دونوں جب چھٹیوں میں گھر جاتے تو ان ہی عزیزوں، دوستوں اور ہم وطنوں کا ماحول ہوتا، جن میں سے بعض یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے، ہم دونوں کے گھرے مراسم ملک مظفر امام عرف محمد وحید مرحوم، سید محی الدین مرحوم اور سید وحید النبی سے زیادہ تھے، ملک مظفر امام ام، اے، او کالج علی گڈھ میں تعلیم پا رہے تھے، اور وہاں کے بڑے ممتاز طالب علم تھے، ۱۹۰۶ء میں بی، اے کیا، اسی زمانہ میں امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کے ولی عہد سردار عنایت اللہ خاں اور ان کے چچا سردار نصر اللہ خاں ہندوستان آئے تو یونیورسٹی کی طرف سے وہ مترجم کی حیثیت سے ان کے ساتھ کیے گئے، اس کے صلہ میں سردار عنایت اللہ خاں نے ان کی بڑی پر زور سفارش کی اور وہ ڈپٹی کلکٹری میں لے لیے گئے، سید صاحب ان کو اور وہ سید صاحب کو بے حد عزیز رکھتے تھے، جب دونوں دیسنہ کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ میں شریک ہو جاتے تو جلسہ کی رونق دوبالا ہو جاتی، سید صاحب ان کے عہدہ سے بہت خوش تھے، لیکن ۱۹۱۳ء میں عین عالم شباب میں ان کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کی خبر سنکر سید صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ مجھ سے کہنے لگے کہ افسوس وہ رہتے اور میں ان کے عوض میں چلا جاتا، سید محی الدین مرحوم میرے سگے ماموں زاد بھائی اور سید صاحب کے رشتہ میں بھتیجے تھے،

وہ پٹنہ میں تعلیم پاتے تھے، ۱۹۰۹ء میں پٹنہ کالج سے بی اے کیا، اور ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد ہوئے، لیکن عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی وفات پا گئے، سید صاحب ان سے بھی بہت ہی قریب تر تھے، اور ان کی وفات پر ایک پر درد مرثیہ انجمن الاصلاح کے جلسہ میں پڑھا، ان کے صاحبزادے سید صباح الدین عبد الرحمن جب دار المصنفین پہنچے تو سید صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب مجھے موقع ملا ہے کہ محی الدین مرحوم کی دوستی اور محبت کا حق ادا کر سکوں، سید وحید النبی بفضل تعالیٰ میری ہی طرح ابھی زندہ ہیں، وہ محکمۂ آبکاری میں انسپکٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں، اور خاندانی ثروت کی وجہ سے بڑی خوشحالی کی زندگی بسر کرتے ہیں، مولانا عبد الماجد دریابادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب گورنر صوبہ بہار جب دیسنہ تشریف لائے تھے، تو ان ہی کے دولتکدہ پر شاندار دعوتیں ہوئی تھیں، سید صاحب ان سے آخر آخر وقت تک بڑے بے تکلف رہے، مذکورۂ بالا دوستوں اور عزیزوں کے علاوہ دیسنہ کے اور تمام انگریزی خوانوں کے ساتھ سید صاحب کا اٹھنا بیٹھنا رہتا تھا، اس لیے وہ ان کے خیالات و رجحانات سے نہ صرف واقف بلکہ غیر شعوری طور پر متاثر بھی ہوتے رہے، اسی لیے ان میں نئی روشنی اور نئی تہذیب کی جھلک نظر آتی تھی، پھر جب ان کا حلقہ وسیع ہوا تو جس طرح وہ علما کی جماعت کے حلقے میں جاتے اسی طرح انگریزی خوانوں کے مجمعوں میں بلا جھجھک شریک ہوتے، اس طرح قدیم و جدید گروہوں کا نقطۂ اتصال بن گئے تھے،

۱۹۰۵ء میں ہم لوگ درجہ ششم میں پہنچے تو اسی سال مولانا شبلی نعمانی ندوہ میں مستقل طور پر آگئے، اور اپریل ۱۹۰۵ء میں معتمد تعلیمات مقرر ہوئے، سید صاحب نے ان کی تشریف آوری کی تقریب مسرت میں ایک فارسی قصیدہ کہا، طلبہ میں علمی و ادبی صلاحیت کے لحاظ سے مولانا شبلی کی نظر سید صاحب اور ضیاء الحسن علوی پر پڑی، اور ان کو انھوں نے ترجمے اور تلخیص کا کام دیا، مولانا شبلی کے پاس عربی کے جتنے نئے رسالے آتے، سید صاحب ان کو پڑھ کر ان سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے،

اس زمانہ میں ہمارے درس میں ادب میں دلائل الاعجاز، حماسہ اور نقد الشعر تھیں جن کو مولانا سید علی زینبی پڑھاتے تھے، اور پوری تیاری کرکے آتے تھے، حدیث میں ترمذی شریف، مؤطا اور بخاری شریف تھیں، ان کا درس مولانا حفیظ اللہ کے متعلق تھا، سید صاحب حدیث کے مطالعہ میں اپنے ہم درس طلبہ سے ہمیشہ آگے رہتے تھے، جب میں ترمذی کی جرح و تعدیل میں لگا رہتا تو وہ شاہ عبدالعزیز کی عجالۂ نافعہ اور بستان المحدثین کی ورق گردانی میں مشغول رہتے، اور جب مؤطا کا دور شروع ہوتا تو سید صاحب شاہ ولی اللہ صاحب کی مسوی شرح موطا کا مطالعہ کرتے رہتے اور جب بخاری شریف کا دور شروع ہوتا تو سید صاحب عینی اور فتح الباری، شرح بخاری اور تذکرۃ الحفاظ پڑھکر اپنی معلومات میں اضافہ کرتے، اسی لیے انکی نظر حدیث پر بڑی گہری تھی، جنوری ۱۹۰۵ء کے الندوہ میں حدیث پر انکا مضمون شائع ہوا تو اسکی ہر طرف سے بڑی تعریف ہوئی،

ندوہ میں درسی کتابوں کے علاوہ طلبہ کے لیے درس قرآن، فلسفہ جدید کی تعلیم اور تقریر کی مشق کا بھی انتظام تھا، درس قرآن میں مستقل طور پر صرف دو طلبہ ہی حاضر رہتے، ایک سید صاحب اور دوسرے ضیاء الحسن علوی، یہ درس مولانا شبلی نعمانی دیا کرتے تھے، کچھ دنوں کے لیے مولانا حفیظ اللہ نے بھی دیا، فلسفہ جدید میں سید صاحب اور ضیاء الحسن علوی کے ساتھ میں بھی شریک ہوتا تھا، لیکن اور طلبہ زیادہ دنوں تک ساتھ نہ دے سکے، اسکی تعلیم مولانا حمید الدین فراہی دُ اور انکے بعد پروفیسر مرزا سید محمد ہادی دیتے تھے، تقریر کی مشق میں بہت سے طلبہ شریک ہوتے، اسکے پہلے گروپ میں عبدالباری بہاری مرحوم، سید سلیمان اور ضیاء الحسن علوی تھے، دوسرے میں خاکسار کے علاوہ حافظ عبدالصمد اعظمی، قمرالدین اعظمی اور محمد یوسف تھے، تیسرے میں عبدالسلام، مسعود علی اور عبدالواجد تھے، ان میں عبدالباری مرحوم نے اچھی مشق پیدا کی، وہ مولوی غلام محمد شملوی سفیر ندوہ کے ساتھ یوپی کے شہروں کا دورہ کرکے تقریریں کرتے تھے۔

۱۹۰۶ء میں ہم لوگوں کے سامنے ندوہ کا پہلا گروہ فارغ التحصیل ہوا، اس میں مولوی عبدالباری مرحوم، مولوی محمد جلیل اعظمی، مولوی عبدالرحمن فتحپوری، مولوی محمد یوسف خلف مولانا حفیظ اللہ صاحب تھے، ان تمام حضرات نے ندوہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد طب شروع کی، البتہ مولوی محمد یوسف ندوہ ہی میں مدرس ہوگئے، ۱۹۰۶ء میں دوسرا گروہ فارغ ہوا جس میں مولوی ضیاء الحسن علوی بھی تھے، وہ ندوہ کے بعد علی گڈھ ایم اے او کالج چلے گئے، اور یہاں سے ایم اے کیا، ۱۹۰۶ء

میں ندوہ کا سالانہ جلسہ بنارس میں ہوا، تو اس میں تقریر کرنے کے لیے ندوہ سے دو طلبہ منتخب ہوئے، مولوی عبدالباری بہاری اور سید صاحب، مولوی عبدالباری کی آواز بلند تھی، انکو غلام محمد صاحب شملوی کیساتھ بہت سی جگہوں پر تقریر کرنے کا اتفاق ہو چکا تھا، اس لیے انکی تقریر ایسی کامیاب رہی کہ مولانا شبلی نے غایت محبت میں عین تقریر کے دوران ہی میں اپنی عبا ان کو پہنا دی، سید صاحب کی آواز دھیمی تھی، اسلیے انکی تقریر کا وہ اثر نہ ہوسکا، جو مولوی عبدالباری کی تقریر کا ہوا تھا، لیکن جو حضرات پنڈال پر تشریف فرما تھے، انھوں نے سید صاحب کی سلجھی ہوئی تقریر کی داد مولانا شبلی کو دی، اور جناب شاہ سلیمان پھلواروی نے خوش ہو کر سید صاحب کو اپنی عبا دینے کا وعدہ کیا، جس کا تقاضا سید صاحب ان سے برابر کرتے رہے، ۱۹۰۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ کی سب اڈیٹری کے بعد وکیل کی ادارت سنبھالنے کے لیے امرتسر چلے گئے، سید صاحب کی تحریر میں اس وقت تک کچھ پختگی آگئی تھی، اسلیے مولانا شبلی نے الندوہ کا پورا کام ان کے ذمہ کر دیا جس کو انھوں نے بڑی خوبی سے انجام دیا، اسی سال ہم لوگوں کا سالانہ امتحان مولانا شبلی نعمانی کی نگرانی میں ہوا، اور سید صاحب کے ساتھ میں بھی امتیازی حیثیت سے پاس ہوا، اس وقت امتحان میں صرف تین طلبہ شریک ہوئے تھے، ہم دونوں اور عبدالخلاق رمضان پوری بہاری تھے،

۱۹۰۷ء کے مارچ میں تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا جس میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک کے فارغ التحصیل طلبہ شریک تھے، حاضرین میں ندوہ کے حامی اور مخالف، ہمدرد اور نکتہ چیں دونوں تھے، اس موقع پر مولانا شبلی نے اپنے مخصوص اور عزیز طلبہ کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرانے کی خاطر ان سے تقریریں کرائیں، پہلے مولوی ضیاء الحسن علوی نے اردو میں کلام پاک کے اعجاز پر تقریر کی، پھر سید صاحب نے "علوم جدید و قدیم" کے عنوان پر اردو میں تقریر شروع کی، تقریر کے دوران ہی میں کسی نے کہا کہ اگر عربی میں تقریر کریں تو ہم ندوہ کی کرامات کا یقین کریں، مولانا شبلی نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہاں یہ عربی میں بھی تقریر کر سکتے ہیں، کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت موضوع مقرر کر دیں، خواجہ غلام الثقلین نے "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" موضوع مقرر کیا، سید صاحب نے بغیر کسی جھجھک کے فوراً عربی میں تقریر شروع کر دی اور بہت فصیح و صحیح زبان میں تقریر کی جس سے حاضرین بہت متاثر ہوئے اور مولانا شبلی نے غایت خوشی میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، اسکے بعد

ندوہ کے معاندین نہ صرف خاموش ہو گئے بلکہ اس کے حامی بن گئے۔ اس جلسہ کی صدارت مولانا غلام محمد صاحب ہوشیارپوری کر رہے تھے، انھوں نے طلبہ کو ایک ایک حمائل مطبوعہ یُبیرت عطا فرمائی، سید صاحب اس حمائل کو ہمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رکھتے اور اسی سے تلاوت فرماتے تھے، اثنائے تلاوت میں کوئی خاص بات ذہن میں آجاتی تو اس کو حاشیہ پر لکھ دیتے، کاش وہ حمائل دار المصنفین کو مل جاتی تو اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا، ورنہ جہاں ہوگی بجز طاق نسیاں پر پڑی رہنے کے کوئی اس سے فائدہ اٹھانے والا نہ ہوگا۔

ہم دونوں ۱۹۰۷ء میں جب ندوہ سے فارغ ہوئے تو میری اور سید صاحب کی راہیں الگ الگ ہو گئیں، میں زندگی کے کچھ نشیب و فراز دیکھنے اور کچھ دنوں طبابت کرنے کے بعد سرکاری اسکول میں عربی، فارسی اور اردو پڑھانے میں لگ گیا لیکن سید صاحب ان تینوں زبانوں میں علمی افق پر بدر کامل بنکر چمکے اور میں انکی ضیا باری کا محض تماشائی بنا رہا،

اوائل زندگی سے آخر وقت تک گھریلو زندگی میں ساٹھ سال سے زیادہ انکا ساتھ رہا، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں بشری کمزوریاں نہیں تھیں لیکن اس طویل مدت میں یاد نہیں آتا کہ انھوں نے مجھے کبھی ایسی بات کہی ہو جس سے مجھکو تکلیف یا اذیت ہوئی ہو، انکی بے تکلفی میں بھی سنجیدگی ہوتی تھی، ہنسی مذاق میں بھی وقار ہوتا، اور اپنے قریب رہنے والوں کو زیادہ اپنا گرویدہ اور شیفتہ بناتے تھے، ہم دونوں نے زندگی کا سفر ساتھ شروع کیا تھا، لیکن وہ جس طرح ہر شعبۂ زندگی میں مجھ سے آگے رہے، اسی طرح سفر آخرت میں بھی سبقت کی اور مجھکو پیچھے چھوڑ گئے، وہ اپنی دینداری، خشیت الٰہی، محبت رسول، پاکیزگی نفس، طہارت طبع اور بلند کرداری کی بدولت اپنے ساتھ بہت کچھ توشۂ آخرت لے گئے، اور اب جب کہ میں خلوت نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہوں اور ان ہی کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن ہوں تو میری آرزو صرف یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں ان سے چولی دامن کا ساتھ رہا، اور انکی دینی، دنیاوی زندگی کے کمال و جمال کو بہت قریب سے دیکھتا رہا، اسی طرح آخرت میں جب ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش ہو رہی ہو، اس وقت میں ان کے ساتھ اس سے محروم نہ رہوں۔ آمین ثم آمین۔

فقہ اسلامی کے مآخذ

از
جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی صدر مدرس دار العلوم معینیہ اجمیر

(۳)

ملکی قانون

ملکی قانون سے استفادہ

فقہ اسلامی کا بارہواں ماخذ "ملکی قانون" ہے۔

قرآن وسنت سے اس کے ثبوت کی دلیل وہی آیتیں اور حدیثیں بن سکتی ہیں جو عرف و رواج کے باب میں مذکور ہو چکی ہیں، دعوتِ الٰہی کے اہم مقاصد میں یامرھم بالمعروف (رسول معروف کا حکم دیتا ہے) کا ذکر ہے اور معروف کے عموم میں وہ ملکی قانون بھی داخل ہیں، جو اسلامی اصول کے موافق ہوں اور شرع اور عقل کے خلاف نہ ہوں،

امت مسلمہ کے "مشن" میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے؛

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۱۱۰)

تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے ظہور میں آئی ہو تم معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے اور اللہ

اس بنا پر یہ امت جہاں جہاں گئی وہاں کے اچھے رسوم و قوانین (معروف) کی حوصلہ افزائی کی، ان سب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ماقبل کی شریعت کے بقایا تھے اور معاشرتی فلاح و بہبود

کے لحاظ سے وہاں کے باشندوں نے کوئی قانون وضع ہی نہ کیا تھا، محض غلط اندیشی اور قومی و جماعتی زندگی سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے بعض پرانے قوانین کو اپنایا

ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے ان قوانین کو معمولی ترمیم و اصلاح کے بعد قبول فرمایا، جو عرب میں رائج تھے، خواہ انکا تعلق ماقبل کی کسی شریعت سے رہا ہو یا نہ رہا ہو، اور بعد میں یہی قوانین فقہ اسلامی کا جزء قرار پاگئے، لیکن اس قبولیت کے ہر مرحلہ میں معاشرہ کی حالت اور عوامی شعور کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا لیا گیا اور جنکو قبول کیا گیا ان میں ان کو اس طرح اسلام کے قالب میں ڈھالا گیا کہ وہ شریعت اسلامیہ میں بالکل ضم ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب میں حسب ذیل قسم کے قوانین موجود تھے:

(۱) مدعی سے دعویٰ کے ثبوت کے لیے گواہ طلب کیے جاتے تھے، اگر گواہ نہ ہوتے اور مدعا علیہ انکار کرتا تو مدعا علیہ کو قسم دی جاتی تھی،

فقہ کا مسلمہ اصول ہے "البینة علی المدعی والیمین علیٰ من انکر" (گواہ مدعی کے ذمہ ہیں اور قسم انکار کرنے والے کے ذمہ ہے)

(۲) نکاح کے کئی طریقے رائج تھے، غلط طریقوں کو موقوف کر کے ان کی جگہ صحیح طریقہ کو قائم رکھا گیا۔

(۳) تملیک جائداد کی مختلف صورتیں رائج تھیں، بیع، ہبہ، رہن، اجارہ وغیرہ، ان کو قائم رکھا گیا اور ان سب کے احکام فقہ میں موجود ہیں، (۴) بیع (خرید و فروخت) کی مختلف شکلیں رائج تھیں، بیع صرف، سلم، مرابحہ، تولیہ وغیرہ، ان میں نزاع اور فساد کی صورتوں کو باطل قرار دیکر صحیح صورتوں کو رواج دیا گیا، فقہ میں ہر ایک کے احکام موجود ہیں (۵) زمین کو اجارہ یا بٹہ پر دینے کا رواج تھا (۶) وصیت کا دستور تھا (۷) معاملات کے تصفیہ اور قوانین کے نفاذ کی مختلف صورتیں رائج تھیں وغیرہ، تفصیل پہلے گذر چکی ہے[۱]۔

[۱] ملاحظہ ہو معارف فروری ۵۵ء

غرض رائج شدہ قوانین میں جو بھی اسلامی اصول کے موافق تھے یا ان کو بروئے کار لانے میں معاون بنتے تھے، ان سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا، اور جن میں کچھ خامی تھی ان میں ترمیم و اصلاح کر کے انھیں موافق بنایا،

صحابۂ کرام کا مختلف ملکوں کے قوانین سے استفادہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام وغیرہ کو جن ملکوں اور قوموں سے سابقہ پڑا انھوں نے بھی ان کے اچھے قوانین کو قبول کیا اور بعد میں وہ سب فقہ اسلامی کا جزء بنے، اس کی چند صورتیں تھیں،

(۱) صحابۂ کرام تجارت کے لیے ملک شام، مصر، حبشہ، عراق، یمن، عمان وغیرہ جایا کرتے تھے، شام و مصر میں رومی اور عراق میں ایرانی قانون سے انھیں سابقہ پڑتا تھا، یمن میں بھی یہود، رومیوں، اور ایرانیوں کے اثرات تھے، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ہی اسلامی فتوحات کا سلسلہ مغربی چین سے اندلس کے کچھ حصہ تک پہنچ گیا تھا، اس وسیع علاقہ میں کئی مستقل تمدن پہلے سے موجود تھے، اور رومی قوانین بھی رائج تھے،

(۲) ان مفتوحہ ممالک کی زبان، کلچر، مذہب وغیرہ ہر شے کی حفاظت اور معاملات کے تصفیہ اور مراسم کی ادائگی میں حتی الامکان ملک و مذہب کے قوانین کا لحاظ کیا جاتا تھا،

واقر اھلھا فیھا علی مللھم وشرائعھم[۱]	ملکوں کے باشندے اپنے مذاہب اور قوانین پر باقی رکھے گئے تھے،

ان کو نکاح، میراث اور دیگر معاملات وغیرہ میں پوری آزادی باقی تھی،

فھم احرار فی شھاداتھم ومناکحاتھم ومواریثھم وجمیع احکامھم[۲]	وہ اپنی شہادت، نکاح، وراثت وغیرہ کے تمام قوانین میں آزاد تھے (اپنے قوانین کے مطابق عمل کرتے تھے)

[۱] کتاب الاموال ص ۱۰۱ [۲] ایضاً

ایک عرصہ تک مفتوحہ ممالک کے دفاتر کی زبان بھی ملکی برقرار رکھی گئی تھی، چنانچہ عراق کا دفتر فارسی میں، شام کا دفتر رومی میں اور مصر کا دفتر قبطی میں تھا، عبد الملک کے زمانہ میں عربی زبان دفتری زبان قرار پائی،

(۳) معاہدین اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، اور اسلامی حکومت میں انھیں پورے حقوق و مراعات حاصل تھے، اور باہمی اخذ و استفادہ کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ ان کے تمدن اور قانون کا اثر بھی اسلامی قانون پر پڑا ہوگا،

حضرت عمرؓ نے مفتوحہ ممالک کے بہت قوانین باقی رکھے

(۴) عراق، شام، مصر کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے بہت حد تک رومی، یونانی اور ایرانی قانون لگان و مالگذاری کو باقی رکھا تھا، البتہ ظلم و زیادتی کی صورتیں اور کاشتکاروں کے ساتھ جو سختی تھی انکی اصلاح و ترمیم کر دی گئی تھی،[1]

(۵) چنگی وغیرہ کے لیے یہ قانون تھا کہ بیرونی ممالک کے تاجروں کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جائے جیسا وہ مسلمان تاجروں کے ساتھ اپنے ملک کے قانون کے مطابق کرتے ہیں، اس طرح بعض ملکی قانون فقہ اسلامی کا جزو قرار پائے،

فقہ کی بنیاد کسی غیر ملکی قانون پر نہیں ہے

اسی طرح مسلمانوں نے دوسری قوموں اور ملکوں کے بعض اچھے قوانین اور دستوروں کو قبول کر لیا اور ان میں اصلاح و ترمیم کرکے انکو اسلامی سانچہ میں ڈھال لیا، مختلف قوموں اور ملکوں میں اس قسم کا جزئی اخذ و استفادہ بالکل فطری اور ناگزیر ہے، اسلام نے بھی اس کی اجازت دی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

الکلمة الحکمة ضالة المومن — اچھی اور عمدہ بات مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں بھی پائے

فحیث وجدھا فھو احق بھا — اس کو لینے کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب اسلام کا زرعی نظام

کلمة الحکمة میں محض اچھی باتیں نہیں بلکہ سب اچھی چیزیں داخل ہیں، لیکن اس کا مطلب نہیں ہے کہ اسلامی فقہ غیر ملکی قانون سے تمامتر ماخوذ ہے، جیسا کہ بعض متعصب مستشرقین لکھتے ہیں کہ وہ رومی قانون سے ماخوذ ہے، اور بعض تو اس کو رومی قانون ہی کی دوسری شکل بتاتے ہیں، لیکن ظن و قیاس کے علاوہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اس کے ثبوت میں یہ چند مثالیں دیجاتی ہیں،

(۱) فقہ کا یہ قانونی کلیہ "البینة علی المدعی والیمین علی من انکر" رومی قانون میں بھی ہے،

(۲) معاملات و مالیات کے بعض احکام میں مشابہت ہے،

(۳) بعض علمی اصطلاحات مثلاً فقہ اور فقیہ کے ہم معنی الفاظ رومیوں میں مستعمل تھے،

(۴) اسلامی فتوحات کے وقت شام میں رومی قانون کے بعض مدارس قیصریہ وغیرہ قائم تھے،

(۵) بعض ایسے ادارے اور محکمے تھے جنھیں قانون روما کے مطابق قوانین نافذ تھے،

لیکن یہ ظاہر ہے کہ فقہ کے پورے دفتر میں ایک دو مثالیں یا کسی قانون میں جزوی مشابہت اور قیاسات، اسلامی فقہ کے رومی قانون سے ماخوذ ہونے کا ثبوت نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ دوسرے قوانین کی طرح فقہ میں رومی قانون سے بھی جزوی استفادہ کیا گیا ہو، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس موضوع پر نہایت فاضلانہ مقالات لکھے ہیں جن میں اس الزام کی بڑی محققانہ تردید کی ہے۔

فقہی اصول و کلیات

ذیل میں چند وہ اصول و کلیات بیان کیے جاتے ہیں جن سے فقہائے اسلام کے اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے، احکام میں تخفیف و سہولت کی صورتیں نکالی ہیں، پھر فقہ کی جدید تدوین کے مرحلہ میں بھی ان سے مدد لی جاسکتی ہے۔

مشقت سہولت لاتی ہے

(۱) المشقۃ تجلب التیسیر — مشقت سہولت لاتی ہے،

اس کی بنیاد قرآن حکیم کی درج ذیل آیتیں ہیں،

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ	اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور
بِکُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ)	دشواری نہیں چاہتا۔
یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ وَ	اللہ چاہتا ہے کہ (بیجا سختیوں کے بجائے) تمہارے
خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (النساء)	بوجھ کو ہلکا کرے، انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔
لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا (البقرۃ)	اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا یہ مقصد بیان کیا گیا ہے:

وَیَضَعُ عَنْہُمْ اِصْرَہُمْ وَالْاَغْلَالَ	اللہ کا رسول اس بوجھ سے نجات دلائیگا جسکے نیچے
الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْہِمْ (الاعراف)	وہ دبے ہوئے ہیں، ان پھندوں سے نکالیگا جنمیں گرفتار ہو گئے۔

یہ بوجھ اور پھندے دین میں غلو اور تقشف کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور دل و دماغ کو مقید و جامد بنادیتے ہیں جس سے زندگی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں، اور انسان سمٹ سمٹا کر ایک چہاردیواری میں محدود ہو جاتا ہے، جیسا کہ ذیل کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین و شریعت کی نفسیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد	دین آسان ہے لیکن جو شخص دین میں مبالغہ
الا غلبہ[1]	کرتا ہے اس پر وہ غالب آجاتا ہے۔

ایک اور موقع پر آپ نے اعتدال و میانہ روی کو نبوت کا جزو فرمایا:

الاقتصاد جزء من خمس وعشرین	میانہ روی (تمام حالتوں اور تمام کاموں میں)
جزءا من النبوۃ[2]	نبوت کا پچیسواں جزء ہے۔

[1] بخاری و مشکوۃ باب القصد فی العمل [2] ابو داؤد و مشکوۃ باب الحذر والتانی فی الامور

زیر بحث مشقت کی تفصیل

یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ فقہاء نے نہ ہر مشقت کو زیر بحث مشقت میں شمار کیا ہے، اور نہ تخفیف و سہولت کو اس قدر عام کیا ہے کہ انسان جب چاہے اس کی راہیں نکالے بلکہ ہر ایک کے لیے شریعت میں اصول و ضوابط مقرر اور حدود و قیود متعین ہیں، الٰہی پالیسی کا بھی تقاضا یہی ہے کہ اس معاملہ میں انسان آزاد نہ چھوڑا جائے، ورنہ دین سہل پسند اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائیگا،

شریعت کا مقصد ہے کہ انسانوں کی زندگی صاف ستھری گذرے، ان میں خیالات و جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت اور ذاتی اغراض و مفاد اور نفسانی خواہشات کو دبانے کی ہمت و طاقت پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ زندگی میں یہ جوہر اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب انسان کی حیوانی جبلت پر اخلاقی پابندیاں اور حدبندیاں عاید ہوں، اور ترک و اختیار کے اخلاقی و قانونی ضابطے مقرر ہوں، اسکے بغیر نہ انسانی زندگی بن سکتی ہے اور نہ صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے،

یہ کیسے ممکن ہے کہ خواہشات کو قابو میں رکھنے کے لیے احکام و قوانین مقرر کیے جائیں اور ان میں انسان کو معمولی تکلیف و مشقت بھی نہ برداشت کرنی پڑے، اور صالح معاشرہ کو بروئے کار لانے کے لیے خار دار جھاڑیوں سے گذرنا پڑے اور جذبات و خواہشات کی حدبندی میں ہر جگہ تخفیف و سہولت ہو،

جہانتک نفس مشقت کا تعلق ہے انسان کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے خالی نہیں ہے، حتی کہ کھانا پینا وغیرہ زندگی کے معمولات میں بھی مشقت ہے، اسی بنا پر فقہاء کہتے ہیں،

فاحوال الانسان کلہا	اس دنیا میں انسان کی ساری حالتیں مشقت
کلفۃ فی ھذہ الدار فی اکلہ	والی ہیں حتی کہ کھانا پینا اور دوسرے تمام کام
وشربہ وسائر تصرفاتہ	مشقت سے خالی نہیں ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے

ولکن جعل له قدرة علیها بحیث تکون تلك التصرفات تحت قهره لا ان یکون هو تحت قهرها (الموافقات ج ۲ ص ۱۲۰)

انسان کو ایسی قدرت و طاقت دی گئی کہ وہ ان مشقتوں پر حاوی ہے نہ یہ کہ مشقتیں انسان پر حاوی ہیں،

ایسی حالت میں شرعی احکام و قوانین کی پابندی میں بالکلیہ مشقت کی نفی کیونکر ممکن ہے، اور ہر معمولی تکلیف میں تخفیف و سہولت کا مطالبہ کیسے جائز ہوگا،

مشقت و تکلیف سے دنیا کا کوئی کام خالی نہیں ہوتا ہے

تکلیف و مشقت کی جتنی مقدار دنیوی جد و جہد کے سلسلہ میں انسان کو برداشت کرنی پڑتی ہے، وہ زندگی کے قیام و بقا کے لیے جس کے بغیر چارہ نہیں ہے، بلکہ ایک مخصوص مقدار صحت و توانائی برقرار رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کا کام جسمانی مشقت کا نہیں ہے، وہ بھی اپنی صحت کی بقا کے لیے تھوڑی سی مشقت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، ورنہ صحت برباد ہو جائے، غرض مشقت کا ایک معتدبہ حصہ زندگی کا ایسا لازمی جزء ہے کہ اس سے کسی صورت میں بھی مفر نہیں ہے، اور ایک حصہ ایسا ہے کہ زندگی کی جد و جہد اور کاروبار میں اس کے بغیر چارہ نہیں ہے، ان دونوں قسموں کو مشقت کے بجائے "محنت" کہنا زیادہ مناسب ہے، اور فقہا کی اصطلاح میں اس کو عادت والی مشقت کہا جاتا ہے، شریعت میں بڑی حد تک ان دونوں میں رخصت اور سہولت نہیں ہے، لیکن جو مشقت ایسی نہیں ہے کہ اس کو عادت میں داخل کیا جا سکے، یا اس کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ قیام و بقا میں مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتی ہو، اس میں البتہ تخفیف و سہولت کی راہیں نکالی جائیں، فقہا اس کو غیر عادت والی یا خارج از عادت مشقت سے تعبیر کرتے ہیں، فقہ کی کتابوں میں اس کی یہ پہچان بیان کی گئی ہے،

زیر بحث مشقت کی پہچان

ان کان العمل یؤدی ... اس کام کی نوعیت ایسی ہو کہ اس پر دائمی

الدوام علیه الی الانقطاع عنه او عن بعضه والی وقوع خلل فی صاحبه فی نفسه او ماله او حال من احواله فالمشقة هنا خارجة عن المعتاد وان لم یکن فیها شیٔ من ذلك فی الغالب فلا یعد له فی العادة مشقة[لہ]

عمل سے جانی و مالی نقصان ہوتا ہو یا اس کے کرانے والے کی حالت میں تغیر واقع ہوتا ہو جس سے لازمی طور سے کام چھوڑنے یا اس میں تخفیف کرنے پر مجبور ہونا پڑے تو اس قسم کی مشقت عادت والی مشقت سے خارج سمجھی جائے گی اور جو ایسی نہ ہوگی وہ عادت سے خارج نہ ہوگی (بلکہ محنت میں شمار ہوگی)

یعنی جو شرعی احکام ایسے ہوں گے جن پر ہمیشہ عمل کرنے سے جانی و مالی نقصان ہو یا انسان کی حالت دن بدن غیر ہوتی جاتی ہو تو اس قسم کی مشقت تخفیف و سہولت کی طالب ہے، اور جو احکام ایسے نہ ہوں گے وہ نہ مشقت کے ذیل میں آئیں گے اور نہ ان میں تخفیف و سہولت کی گنجایش ہے،

مشقت کی قسمیں فقہا نے اصولی حیثیت سے مشقت کی دو قسمیں بیان کی ہیں: (۱) واقعی مشقت اور (۲) وہمی مشقت،

(۱) واقعی مشقت۔ شارع نے رخصت و سہولت کے جو اسباب بیان کیے ہیں انھیں سامنے رکھکر تخفیف کی صورت نکالی جائے۔ وہ اسباب یہ ہیں:

(۱) سفر (۲) مرض (۳) اکراہ (جبر و زبردستی) (۴) نسیان (۵) جہل (لاعلمی) (۶) عسر (مشکل اور دشواری میں پڑ جانا) (۷) عموم البلویٰ (عام طور پر لوگوں کا مبتلا ہونا) (۸) نقص (قدرتی طور پر کمی) (۹) جنون (۱۰) بیہوشی (۱۱) نیند (۱۲) کمسنی وغیرہ،

واقعی مشقت کی مثال وہ مریض ہے جس نے روزہ رکھکر ابھی نہیں دیکھا کہ وہ مرض کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے گا، لیکن تجربہ اور مستند حکیم کی رائے پر اس کو یقین ہے کہ روزہ رکھنے میں انتہائی مشقت برداشت کرنی پڑے گی، چونکہ مریض کے لیے شریعت میں رخصت موجود ہے اس لیے ایسے مریض کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیجائے گی، گو اس نے اس کا حالیہ تجربہ نہیں کیا ہے۔

فقہا نے تخفیف و سہولت کے معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، اور حتی الامکان اس سے گریز کیا ہے، چنانچہ مذکورہ صورت میں ان کے نزدیک اصل مشکل یہ ہے، کہ پہلے مریض کو روزہ رکھکر دیکھنا چاہیے، اگر ناقابل برداشت ہو اس وقت رخصت پر عمل کرنا چاہیے، لیکن اگر کسی نے ایسا نہیں کیا بلکہ گذشتہ تجربہ ہی کو کافی سمجھا تو علت (مریض پائے جانے) کی وجہ سے اجازت دیدیجائے گی۔

وہمی مشقت یہ ہے کہ شارع نے جن اسباب اور علتوں کا اعتبار کرکے رخصت اور سہولت کی اجازت دی ہے وہ عادۃً تو موجود ہوں لیکن فی الحال نہ پائی جارہی ہوں تو ایسی صورت میں ان کا اعتبار نہ ہوگا، ورنہ ان کی وجہ سے رخصت اور سہولت کی اجازت ہوگی، مثلاً ایک شخص کو باری سے (ناغہ کرکے) بخار آتا ہے، باری کے دن اس وقت تک رخصت کا مستحق نہ ہوگا جب تک اسے بخار شروع نہ ہو جائے، اسی طرح عورتوں کے مخصوص دنوں کی جب تک ابتدا نہ ہوجائے وہ رخصت کی مستحق نہ قرار پائیں گی، غرض اس قسم کی صورتوں میں عادۃً علت کا موجود ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا وقوع ضروری ہے، کیونکہ بسا اوقات عادت کے خلاف ہوتا رہتا ہے، اور عادت بدلتی رہتی ہے، اگر اسی کو مدار بنالیا جائے تو احکام میں نظم وضبط نہ قائم رہ سکے گا جو شریعت کی جان ہے۔

مشقت کے درجہ اور مرتبہ

فقہا نے مشقت کے درجہ اور مرتبہ بھی مقرر کیے ہیں، جن کی بنا پر وہ رخصت اور سہولت کا فیصلہ کرتے ہیں، مثلاً

(۱) اونچا درجہ یہ ہے کہ کسی حکم پر عمل کرنے سے انسان کو اتنی مشقت برداشت کرنی پڑے کہ

اس سے جان یا کسی عضو کو نقصان پہنچے، یا اس کے ان منافع کے زائل ہونے کا اندیشہ ہو، جن کے لیے اس کی ساخت ہوئی ہے۔

(۲) ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ حکم پر عمل کرنے سے معمولی اور ہلکی پھلکی تکلیف ہو، سر یا کسی عضو میں معمولی درد کا اندیشہ ہو، یا مزاج پر ہلکے قسم کے اثر کا خوف ہو۔

(۳) درمیانی درجہ یہ ہے کہ حکم پر عمل کرنے سے اتنی مشقت برداشت کرنی پڑے جو ان دونوں کے درمیانی ہو، مثلاً مرض کی حالت میں روزہ رکھنے سے مرض بڑھ جانے یا دیر میں اچھے ہونیکا اندیشہ ہو۔

ان تینوں درجوں میں اونچے اور درمیانی درجہ کی حالت رخصت اور سہولت پیدا کرتی ہے، ادنیٰ درجہ میں رخصت کی گنجایش نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کی چیزیں معمولات میں معمولی تبدیلی سے پیدا ہوتی اور دور ہوتی رہتی ہیں، اور ان سے جس قسم کی خفیف مضرت پیدا ہوتی ہے، اس کو روکنے سے زیادہ بہتر اس مصلحت کا حاصل کرنا ہے جو حکم پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔[۱]

مشقت کے استعمال میں حدبندیاں اور پابندیاں

فقہا نے مشقت کے استعمال اور اس کے ذریعہ رخصت اور سہولت کی اجازت میں حدبندیاں قائم کی ہیں اور پابندیاں لگائی ہیں تاکہ حیلہ جو اور آزاد طبیعتیں بے محل یا ضرورت سے زیادہ اس کا استعمال نہ کرسکیں، مثلاً

(۱) جس حکم کے بارے میں شارع کی طرف سے صراحت موجود ہوگی اس میں مشقت کا مذکورہ اصول نہ چل سکے گا، اور جہاں یہ صراحت نہ ہوگی اور واقعی ضرورت بھی ہوگی تو صرف ضرورت کی حد تک اس اصول سے کام لیا جائے گا۔

المشقة والحرج انما يعتبر فی موضع لا نص فيه اما مع النص بخلافه فلا[۲]

مشقت اور حرج کا وہیں اعتبار کیا جائیگا جہاں شارع کی طرف سے صراحت نہ ہوگی اور جہاں صراحت مشقت کے تقاضا کے خلاف موجود ہوگی وہاں اعتبار نہ ہوگا۔

۱؎ الاشباہ والنظائر ص ۷۵ ۲؎ حوالہ بالا ص ۷۵

احکام و قوانین کے وضع کرنے میں اسلام کا یہ نقطۂ نظر ظاہر ہے کہ وہ ایسے ہوں کہ انکے ذریعہ منافع کا حصول اور مضرت کا دفعیہ ہوتا رہا ہے، اس نقطۂ نظر کی رعایت جس باریک بینی اور دقیقہ رسی کیساتھ عالم الغیب والشہادۃ کیجانب سے ہو سکتی ہے ظاہر ہے کہ عام مادی نظریں اسکا تصور بھی نہیں کر سکتی ہیں، بسا اوقات بادی النظر میں ایک چیز انسان کی انفرادی، معاشرتی یا تمدنی زندگی کے لیے نہایت مفید اور کارآمد معلوم ہوتی ہے، لیکن گہرائی میں نتائج کے لحاظ سے ایسی مضرتیں پنہاں ہوتی ہیں کہ ہم اس کا احساس بھی نہیں کر سکتے ہیں، اسی طرح بظاہر ایک چیز ضرر رساں اور بیکار معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس میں بہت سے مصالح و مفاد پنہاں ہوتے ہیں جن کا ہم ادراک نہیں کر سکتے،

قرآن حکیم کی درج ذیل آیت میں اسی اصول کی طرف اشارہ ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (بقرہ)

تمھیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناگوار ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ تم ایک بات کو ناگوار سمجھو اور وہ تمھارے حق میں بہتر ہو اور بہت ممکن ہے کہ ایک بات تمھیں اچھی لگتی ہو اور وہ تمھارے حق میں بری ہو، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بظاہر جنگ و خونریزی بری چیز ہے، اس میں خود اپنی ہلاکت کا بھی خوف ہے لیکن بعض حالات میں ناگزیر ہو جاتی ہے، اور اس کے بغیر زندگی قائم نہیں رہ سکتی اور شر کا ازالہ نہیں ہو سکتا، اور خیر کے قیام کے لیے جنگ ضروری ہو جاتی ہے،

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی معاشرتی اور سماجی زندگی کے باریک تاروں کو سمجھنا اور پھر اسکی روشنی میں راہ عمل متعین کرنا آسان کام نہیں ہے، اگر ایسا ہی آسان ہوتا تو جس طرح عالمی تصرفات کو انسان کے حیطۂ اقتدار میں دیدیا گیا ہے، اسی طرح اس کو بھی دیدیا جاتا، اس کے لیے نہ ہدایت الٰہی کے تسلسل کی ضرورت ہوتی اور نہ دین کے تکمیل کی، اس لیے مشقت کے استعمال اور اس کے ذریعہ رخصت و سہولت کی

اجازت میں بھی بڑی احتیاط اور نکتہ سنجی کی ضرورت ہے، نہ ہر شخص یہ کام کر سکے گا اور نہ اس بارے میں ہر ایک کا فیصلہ قابل اعتبار ہوگا،

مشقت میں جذباتی و نفسانی چیزوں کا ہر جگہ اعتبار نہ ہوگا

(۲) مشقت میں نفسانی خواہشات اور جذباتی میلانات کا بڑی حد تک اعتبار نہ ہوگا، کیونکہ شریعت کا مقصد ہے کہ انسان خواہشات کا تابع نہ بنے، بلکہ خواہشات کو شریعت کا تابع بنائے، قرآن و سنت کی بیشمار تصریحات اسکی تائید میں موجود ہیں۔

قرآن حکیم میں خواہشات کے اتباع کی برائی اس طرح بیان ہوئی ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (الجاثیہ)

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو معبود بنا رکھا ہے،

ایک اور موقع نفسانی و جذباتی فیصلہ کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہوئے فرمایا گیا ہے،

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ

انسان کا نفس برائی پر بہت زیادہ آمادہ کرنے والا ہے (اسکے غلبہ سے بچنا آسان نہیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کا معیار یہ مقرر فرمایا ہے،

لا یؤمن احدکم حتی یکون هواه تبعا لما جئت به ([illegible])

تم میں سے کوئی شخص اسوقت تک پورا مومن نہیں ہو سکتا جبتک کہ اسکی خواہشات اس (شریعت) کی تابع نہ ہوں

اسی بنا پر فقہاء کہتے ہیں:

ان قصد الشارع من وضع الشرائع اخراج النفوس عن اهوائها وعوائدها فلا تعتبر في الشريعة الرخصة بالنسبة الى كل من هوىٰ نفسه[1]

شارع کا مقصد شریعت کے وضع کرنے سے انسانوں کو نفسانی خواہشات و عادات سے باہر نکالنا ہے اسلیے رخصت و سہولت میں انسان کی ہر مرضی اور خواہش کا اعتبار نہ ہوگا،

---

[1] الموافقات للشاطبی ج ۱ ص ۳۳۶

ایک اور موقع پر ہے:

وضع الشریعۃ علی ان تکون اھواء النفوس تابعۃ لمقصود الشارع فیھا[1]

شریعت اس لیے وضع کی گئی ہے کہ نفسانی خواہشیں شارع کے مقصود کے تابع بنیں۔

شارع نے جذبات وخواہشات کا ایک حد تک اعتبار کیا ہے

مگر یہی نہیں ہے کہ شریعت نے خواہشات وجذبات کا بالکلیہ اعتبار نہ کیا ہو بلکہ حصول منافع اور دفع مضرت کے لیے جن جن خواہشات وجذبات کی جہاں جہاں رعایت ضروری تھی شارع نے خوردبینی سے انکا مشاہدہ کرکے احکام و قوانین میں ان کی پوری رعایت کردی ہے، چنانچہ بہت سے مسائل میں اصول کلیہ کے خلاف موقع ومحل کی مناسبت سے وسعت سے کام لیا گیا ہے۔

فقہا نے بھی اس رعایت کو تسلیم کیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

وقد وسع اللہ تعالیٰ علی العباد فی شھواتھم واحوالھم وتنعماتھم علی وجہ لا یفضی الی مفسدۃ ولا یحصل بھا المکلف علی مشقۃ ولا ینقطع بھا عنہ التمتع اذا اخذہ علی الوجہ المحدود فلذلک شرع لہ ابتداء رخصۃ السلم والقراض والمساقاۃ وغیر ذلک مما

اللہ تعالیٰ نے انسانی خواہشات، اسکے مختلف حالات اور اسکی خوش عیشی کے بارے میں اس طرح وسعت سے کام لیا ہے کہ جس سے نہ کوئی مضرت پہنچے، نہ مشقت ہو اور نہ فائدہ کا سلسلہ بند ہو، یہ اسی صورت میں ممکن ہو جب محدود طریقہ پر محدود پیمانہ میں انھیں استعمال کیا جائے۔ اسی وسعت کی بنا پر شارع نے ابتدا میں بیع سلم قرض پر باہمی لین دین اور مشترکہ کھیتی وغیرہ کی اجازت دی ہے اگرچہ ان میں

[1] الموافقات للشاطبی ج ۱ ص ۳۳۶

ھو توسعۃ علیہ وان کان فیہ مانع فی ۔۔۔ دوسرے قاعدہ کے لحاظ سے ممانعت موجود ہے۔[1]

مشقت میں متوقع اور غیر متوقع خطرات کا اعتبار نہیں ہے

(۳) مذکورہ مشقت کے استعمال میں متوقع وغیر متوقع خطرات کو ڈھونڈھ کر نکالنا یا نیکی وپرہیزگاری کے زعم میں معمولی مضرت کے اندیشہ سے اونچے درجہ کی مضرت قبول کرلینا اور رخصت وسہولت پیدا کرنے کے لیے محض احتمال وامید کا اعتبار کرنا وغیرہ درست نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب دل میں اخلاص وصداقت نہیں ہوتا اور خارجی اثرات کا غلبہ ہوتا ہے تو سادہ احکام و قوانین میں بھی طرح طرح کی پیچیدگیاں اور دشواریاں نظر آتی ہیں، ایسے موقع پر انسان طرح طرح حیلے کرکے بچاؤ کی صورت نکالتا ہے اور اسے معقول بنانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کردیتا ہے بلکہ بسا اوقات نیکی وپرہیزگاری کا خیال خود نیکی و پرہیزگاری ہی کے خلاف استعمال کرنے لگتا ہے، قرآن حکیم میں اس قسم کی تمام باتوں کی ممانعت وارد ہوئی ہے،

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِي وَلَا تَفْتِنِّي أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا (التوبہ)

(اور بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں مجھے اجازت دیجئے اور فتنہ میں نہ ڈالیے، یاد رکھو یہی لوگ فتنہ میں گر پڑے (جھوٹے بہانے بنا کر اللہ کی راہ اور اس کے حکم سے منہ موڑا)

قیام وبقا کی جد وجہد خواہ ابتدائی مرحلہ میں ہو یا درمیانی مرحلہ میں محض وہمی وفرضی باتوں اور معمولی مشقتوں کی بنا پر احکام وقوانین سے گریز کرنا اور یہ گمان کرلینا کہ عمل کی مشقت سے ہم فتنہ میں مبتلا ہوجائیں گے خود یہ بہت بڑا فتنہ اور نفس کا فریب ہے،

فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ (التوبہ)

جو لوگ جہاد میں شریک نہیں ہوئے وہ اس بات پر خوش ہیں کہ اللہ کے رسول کی خواہش کے خلاف اپنے گھروں میں بیٹھے رہے ان پر یہ گراں گذرا کہ انھوں نے اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں،

حق کی راہ اور صالح معاشرہ کے قیام میں آزمایش اور تکلیف میں مبتلا ہونا لازمی ہے، اسلیے ہر ایسے موقع پر رخصت وسہولت کی خواہش کرنا اور خود فریبی سے دل خوش کرلینا حق پرستی نہیں ہے، دین کو چھوڑیے، دنیاوی جد وجہد میں بھی تکلیف ومشقت کے بغیر چارہ کار نہیں، انسان حصول دنیا کے لیے کیا کیا مشقتیں نہیں برداشت کرتا، ایسی حالت میں دین کا حصول بغیر مشقت کیونکر ممکن ہے۔

(باقی)

[1] الموافقات ج ۱ ص ۳۳۷

مسلمانوں کے ہندسی ادب کی ثروت

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری، ایم، اے

(۲)

علم ہندسہ کا آغاز علم کے بہت سے دوسرے شعبوں کی طرح علم ہندسہ بھی ابتداءً انسان کی عملی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے پیدا ہوا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کا آغاز مصر میں ہوا، جہاں دریائے نیل کے سیلاب کی وجہ سے مختلف کھیتوں کی حد بندی اور تشخیص خراج کے لیے زمین کی پیمایش ہر سال ناگزیر ہو جاتی تھی، قدیم یونانیوں نے مصریوں سے اس طریق پیمایش کے غیر منظم اصول و مبادی کو سیکھا اور ترقی دیکر اس علم کی بنیاد ڈالی جو دارس میں "استخراجی ہندسہ" کے نام سے مشہور ہے،

پہلا یونانی عالم جس نے مصری ہندسہ کو یونانیوں سے متعارف کرایا تالیس الملطی (Thales of Miletus) ہے۔ پروفیسر برنیٹ لکھتا ہے:

"مصری علم الہندسہ کو یونان میں داخل کرنے کا کام بلاکسی استثناء کے تالیس الملطی کیجانب سے منسوب کیا جاتا ہے"[۱]

تالیس کے بعد فیثاغورث (Pythagoras) نے علم ہندسہ کے ساتھ خصوصیت سے اعتناو اہتمام کیا، اس کی اور اس کے پیرؤوں کی فلسفیانہ تفکیر کا مدار بھی ریاضیاتی علوم تھے [فیثاغورث ہی کی جانب اقلیدس کے مقالۂ اولی کی شکل ۴۷ (شکل عروسی) منسوب ہے] فیثاغورث کے بعد دوسرے یونانی حکما نے خود کو ہندسی تحقیقات کے لیے وقف کیا، ان کی کوشش سے علم ہندسہ میں تنوع اور وسعت اور

[۱] Burnet : Early Greek Philosophy P.43

ہیئتی مسائل کے لیے نئی نئی بحثیں پیدا ہوئیں، اور ان کی منظم ترتیب و تدوین سے علم ہندسہ کی مختلف شاخیں وجود میں آئیں۔ ان میں سب سے اہم وہ شاخ ہے جسے "اصول ہندسہ" کہتے ہیں، "اصول ہندسہ" کی حقیقت و ماہیت برقلس (Proclus) کے لفظوں میں حسب ذیل ہے:

"علم ہندسہ کی بنیاد چند ایسی اساسی اشکال پر ہے جن کا باقی اشکال ہندسہ سے وہی تعلق ہے جو اصول کا فروع کے ساتھ ہوتا ہے، اور جن کے ذریعے ان کے تمام خواص کا ثبوت مہیا ہوتا ہے۔ ان بنیادی اشکال کو "اصول" (Elements) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے"[۱]

"اصول ہندسہ" کی تعلیمی اہمیت کے بارے میں طوبیقا کے آٹھویں مقالے میں لکھا ہے:

"علم ہندسہ کے لیے اصول (ہندسہ) میں تبحر مستحسن ہے"[۲]

اصول ہندسہ کی ترتیب و تدوین اس اہم موضوع پر سب سے پہلے بقراط کیوسی (Hippocrates of Chios) (زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا نصف آخر) نے ایک مستقل کتاب تصنیف کی۔ پھر لاؤن (Leon) نے اس فن میں کتاب لکھی۔ لاؤن افلاطون (۴۲۹ھ۔ ۳۴۸ ق م) سے کچھ چھوٹا تھا، مگر اس کا شاگرد نہیں تھا، اقادیمیا (افلاطون کے مدرسہ) میں علم ہندسہ کی جو کتاب پڑھائی جاتی تھی وہ ثیوذیوس مغنیسا وی (Theudius of Magnesia) کی تصنیف تھی[۳]، لیکن مسلمان مورخین کا کہنا ہے کہ خود افلاطون نے اصول ہندسہ پر ایک کتاب لکھی تھی، تفصیل آگے آرہی ہے۔

لیکن یونان کی ہندسی عبقریت کا لافانی شاہکار اقلیدس (زمانہ ۳۰۰ ق م کے قریب) کی "اصول ہندسہ" ہے جو اگرچہ اس کے پیشروؤں ہی کے اکتشافات پر مبنی ہے مگر اس کی خوبی وجودت اور حسن تنظیم کے پیش نظر سابق کے تمام "اصول ہندسہ" ماند ہو کر رہ گئے اور آج کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ برقلیس نے ایک مثالی "اصول ہندسہ" کے ممیزات بیان کرنے کے بعد اقلیدس کے

[۱] T. L. Heath : Thirteen Books of Euclid vol.1 P.114 [۲] ایضاً ص ۱۱۶ [۳] ایضاً ص ۱۱۶-۱۱۷ T.L.1

اصول ہندسہ کے بارے میں لکھا ہے:

"اقلیدس کا نظام "اصول" بقیہ (سابقہ) کتب اصول کے مقابلہ میں فایق و برتر ثابت ہوا ہے کیونکہ اس کی افادیت مادہ اولین کی اشکال (مجسمات خمسہ Primordial figures) کے ہندسی خواص کی تحقیقات میں اعانت کرتی ہے۔ اس کے وضوح اور کمال نظم کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ بسیط ترین اشکال ہندسیہ سے پیچیدہ تر اور زیادہ غامض ہندسی مسائل مستنبط کیے جاتے ہیں اور تحقیق کا مدار تصورات اولیہ پر ہے۔"[1]

یہی نہیں بلکہ آج بھی اقلیدس کے اصول ہندسہ سے استفادہ کیے بغیر چارہ نہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا آرٹیکل نویس "جیومیٹری" لکھتا ہے:

"یونانیوں کی سب سے جامع اور منظم کوشش جو انھوں نے ہندسی اشکال کو ایک منطقی سلسلے میں مرتب کرنے کے ضمن میں کی (کہ ہر ابتدائی شکل اپنی پیشرو سے مستخرج ہو) اور جو ہم تک پہنچی ہے وہ ادبیات عالم کے شاہکاروں میں سے ہے یعنی اقلیدس اسکندرانی کی "کتاب الاصول"....... آج سے ایک نسل پہلے تک اس قدیم تصنیف کے حرفی ترجمے انگلستان کے تمام پبلک اسکولوں میں بطور درسی کتاب کے مروج تھے، عہد حاضر میں تمام ممالک کے اندر ہندسہ کی درسی کتابیں اصول اقلیدس ہی کے انتخابات پر مبنی ہیں جو نو عمر طالب علموں کی تعلیمی سہولتوں کے پیش نظر کیے گئے ہیں، لیکن یہ انتخابات تعلیمی سہولتوں کا دعویٰ کریں تو کریں، ان کے اندر تعلیمی سہولت کی خاطر ہندسی تفکیر کی منطقی صحت اور جامعیت قربان ہو گئی ہے۔"[2]

اقلیدس مسلمانوں سے پہلے

علم ہندسہ کا یہ لافانی شاہکار مسلمانوں کی مساعی علمیہ کا موضوع بنے بغیر کیسے بچ سکتا تھا، اس سلسلے میں ان کی سعی مسلسل کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان کے پیشرووں نے اس کتاب

[1] T.L. Heath: Thirteen Books of Euclid Vol. I P. 115
[2] Encyclopaedia Britanica Vol. I P.

کے ساتھ جو اعتنا کیا ہے اس کی تفصیل ضروری ہے، اصول اقلیدس سنہ ۳۰۰ ق م کے قریب تصنیف ہوئی اور آخری یونانی مہندس برقلس (۴۱۲ء – ۴۸۵ء) ہے، اس کے بعد اقلیدس کے ساتھ یونان میں اعتنا نہیں کیا گیا، اس سات سو آٹھ سو سال کے عرصہ میں اصول اقلیدس کے سلسلے میں خود یونانی ثقافت نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل "شروح اقلیدس" اور "شرح مصادرات وحل شکوک" کے ذیلی عنوانات کے تحت آگے آرہی ہے۔

لیکن بعثت اسلام کے قبل دنیا کی عظیم الشان ثقافت رومی و بازنطینی تہذیب تھی، رومیوں نے ۱۴۶ ق م میں یونان کو اور ۳۰ ق م میں مصر کو جو یونانی ثقافت کا گہوارہ تھا، فتح کر کے رومن امپائر میں مدغم کر لیا تھا، پھر فتح یونان کے وقت رومی فاتحین بداوت و بربریت سے نکل کر آئے تھے، بلکہ ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک اور ایک ترقی یافتہ تہذیب کے علمبردار تھے، جس کا نظام قانون آج بھی یورپ کے قانونی نظاموں کی اساس ہے، بااینہمہ اقلیدس کے ساتھ انھوں نے کوئی اعتنا نہیں کیا، اقلیدس کا واحد ترجمہ جو رومن دنیا میں مروج رہا بوئیتھیوس (Boethius) کا کیا ہوا تھا، مگر یہ صرف اصول اقلیدس کے ابتدائی مقالوں کی تلخیص تھی[1]، لاطینی زبان میں پہلی مرتبہ کامل اقلیدس کا ترجمہ ایتھلارڈ (Athelhard) نے ۱۱۲۰ء میں کیا، لیکن یہ ترجمہ یونانی سے نہیں بلکہ عربی سے کیا گیا، مگر یہ ترجمہ رومن امپائر کی علمی سرپرستی یا بازنطینی تہذیب کے کارنامے کے بجائے قرون وسطیٰ کے یورپ کی ثقافتی مساعی میں محسوب ہونے کا زیادہ مستحق ہے۔

غرض ۱۴۶ ق م سے جبکہ رومیوں نے یونان کو فتح کیا ۱۱۲۰ء تک ایتھلارڈ نے عربی سے لاطینی میں اقلیدس کا ترجمہ کیا، علم ہندسہ کی سرپرستی کے سلسلے میں رومی ثقافت کا کارنامہ محض اس قدر ہے کہ اس نے اقلیدس کے کچھ ابتدائی مقالوں کی تلخیص کی اور بس،

[1] T.L. Heath: Thirteen Books of Euclid Vol. I P. 92

اس کے مقابلے میں علم ہندسہ کے ساتھ اسلامی ثقافت کے اعتنا کا یہ عالم ہے کہ ڈیڑھ سو سال کی مدت میں [منصور کے زمانہ سے لیکر جبکہ بقول ابن خلدون اقلیدس کا عربی میں پہلا ترجمہ ہوا، اسحٰق بن حنین اور ثابت بن قرہ کے زمانہ تک جبکہ اقلیدس کا مروجہ ترجمہ ہوا] نہ صرف یونان کا ہندسی سرمایہ عربی میں منتقل ہو گیا، بلکہ مہندسین اسلام نے اپنے پیشرو یونانی فضلا کی کوتاہیوں کی اصلاح کر کے اپنی سعی پیہم سے یونانیوں کے ہندسی ورثہ سے کہیں زیادہ ہندسی ادب پیدا کر دیا، اسکی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) اصول ہندسہ۔ ۱۔ اصول ہندسہ کا ترجمہ

اصول اقلیدس کا ترجمہ | اقلیدس کا سب سے پہلا ترجمہ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (۱۳۶ھ ۔ ۱۵۸ھ) کے عہد میں ہوا۔ ابن خلدون لکھتا ہے:

فبعث ابو جعفر المنصور الی ملک[1]	عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے قیصر روم کو لکھا
الروم ان یبعث الیه بکتب التی	کہ ریاضیات کی کتابیں ترجمہ کرا کے اسے بھیج بھیجے،
بھا مترجمة فبعث الیه بکتاب	چنانچہ اس نے کتاب اقلیدس اور طبیعیات کی کچھ
اوقلیدس وبعض کتب الطبیعیات	کتابیں بھیجیں، ان کتابوں کو مسلمانوں نے
فقرأ ها المسلمون واطلعوا علی ما	پڑھا اور ان میں جو کچھ لکھا تھا اس پر مطلع ہوئے،
فیھا وازدادوا حرصاً علی الظفر	اس سے ان کتابوں کو حاصل کرنے کے لیے جو
بما بقی منھا[1]	باقی رہ گئی تھیں، ان کا شوق بڑھ گیا،

یہی نہیں بلکہ سب سے پہلی کتاب جو منصور کے زمانہ میں عربی کے اندر ترجمہ ہوئی اقلیدس کی کتاب "الاصول" تھی۔ ابن خلدون آگے چل کر لکھتا ہے:

کتاب اوقلیدس ویسمٰی کتاب الاصول	کتاب اوقلیدس اور اسے کتاب الاصول بھی کہا جاتا ہے

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۲۶

...... اول ماترجم من کتب	...... یونانی کتابوں میں سب سے پہلی
الیونانیین فی الملة ایام ابی	کتاب ہے، جو ابو منصور کے زمانۂ خلافت
جعفر المنصور[1]	میں مسلمانوں میں ترجمہ ہوئی۔

لیکن منصور کے زمانہ میں اقلیدس کا جو عربی ترجمہ ہوا تھا، اس کی تفصیل تاریخ نے محفوظ نہیں رکھی، غالباً بعد کے ترجموں نے جو اس سے زیادہ سلیس اور رواں تھے، اس کو بالکل فراموش کر دیا، اس کے تقریباً تیس سال بعد ہارون الرشید کے عہد میں یحییٰ بن خالد برمکی کے ایما سے حجاج بن مطر نے پھر اقلیدس کا ترجمہ کیا، ابن الندیم لکھتا ہے:

نقله الحجاج بن یوسف بن مطر نقلین	حجاج بن یوسف بن مطر نے (یونانی زبان سے) اقلیدس
احدھما یعرف بالھارونی	کے دو ترجمے کیے: ایک نقل ہارونی کے نام سے مشہور ہے
وھو الاول ونقلاً ثانیا ویعرف	اور وہ پہلا ترجمہ ہے، اور دوسرا ترجمہ نقل مامونی کے
بالمامونی وعلیه یعول[2]	نام سے مشہور ہے اور اسی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

حجاج بن مطر کا پہلا ترجمہ تیسری صدی کے آغاز تک رائج رہا، مگر مامون الرشید کے عہد میں خود حجاج نے اقلیدس کا از سر نو ترجمہ (نقل مامونی) کیا، چنانچہ اس کے دیباچہ میں لکھا ہے:

ہارون الرشید کے عہد خلافت میں یحییٰ بن خالد برمک کے ایما سے حجاج اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوا، لیکن جب المامون خلیفہ ہوا تو چونکہ نئے خلیفہ کو علم و ہنر کی ترقی سے بڑی دلچسپی تھی، حجاج نے اس کے التفات خسروانہ کو حاصل کرنے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کتاب کی توضیح و تفسیر کے ساتھ اس کی تہذیب بھی کی، اس نے غیر ضروری طوالتوں کو حذف کر دیا، وضاحت طلب ابہامات کی خلا کو پر کیا، اغلاط کی اصلاح کی اور کتاب پر نظر ثانی کے ساتھ اسے اس طرح مختصر کیا کہ مطالب کتاب سے ہی

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۳۲ [2] الفہرست لابن الندیم ص ۳۷۱

کوئی بات: چھوٹنے پائی، اس طرح اہل علم و شائقین فن کے واسطے ایک عمدہ اڈیشن مرتب کیا، مگر پہلا ترجمہ جن لوگوں کے پاس تھا، اسی طرح رہا۔

لیکن اقلیدس کے "ترجمہ منصوری" کی طرح "نقل ہارونی" بھی آج نایاب ہے، صرف نقل مامونی کے چھ مقالے لیڈن میں ہیں (Codex Ledeusis 399,1) جنھیں Besthorn اور Heiberg نے شائع کر دیا ہے، حجاج کے ترجمہ (مامونی) کے غالباً مجسمات پر تین مقالے [گیارہویں بارہویں اور تیرہویں] بوڈلین لائبریری میں موجود ہیں، نمبر ۲۸۰۔ اس سلسلے میں کارادی فو Carra da Vaux سے جس نے مسٹر آرنلڈ کی (Legacy of Islam) میں مسلمانوں کے ریاضی و ہیئت پر مقالہ لکھا ہے، بڑی چوک ہوئی ہے، وہ لکھتا ہے:

Euclid as well as The Almagest was Trans-
-lated into Arabic by Al-Hajjaj .... His
Translation comprises the first six books of Euclid."[1]

[یعنی اقلیدس اور اسی طرح المجسطی کو عربی میں حجاج بن یوسف نے ترجمہ کیا.........
اس کا ترجمہ اقلیدس کے پہلے چھ مقالوں پر مشتمل ہے]

حالانکہ ابن الندیم کی تصریح کے مطابق اس نے دو مرتبہ ترجمہ کیا تھا اور یہ دونوں ترجمے کمل تھے، پہلا ترجمہ تو جلد ہی غائب ہو گیا، لیکن دوسرا ترجمہ محقق طوسی کے زمانہ تک موجود تھا، اور اس نے بالتصریح لکھا ہے کہ یہ کمل اور پندرہ مقالوں پر [تیرہ اصل اقلیدس کے اور دو حکیم البقلاؤس کے لمحقات] مشتمل تھا، محقق طوسی نے لکھا ہے۔

اقول الکتاب یشتمل علی خمسة عشر مقالة مع الملحقين بآخره وهي اربعمائة وثمانية وستون شكلا في نسخة الحجاج وبزيادة عشرة اشكال في نسخة ثابت[1]

کتاب مع حکیم البقلاؤس کے لمحقات کے پندرہ مقالوں پر مشتمل ہے اور وہ حجاج کے نسخہ میں ۴۶۸ شکلیں ہیں، اور ثابت بن قرہ کے نسخہ میں اس سے دس شکلیں زیادہ ہیں۔

[1] T.L. Heath: Thirteen Books of Euclid Vol. I P.75
[2] Arnold: Legacy of Islam P. 380.

طوسی کہتا ہے کہ یہ اختلاف صرف دسویں مقالے تک ہے، بعد کے مقالوں میں حجاج اور ثابت کے نسخوں میں کوئی فرق نہیں ہے، چنانچہ گیارہویں مقالے کے شروع میں لکھتا ہے:

وليس في المجسمات خلاف بين نسختي الحجاج وثابت[2]

اور مجسمات (گیارہویں سے پندرہویں مقالے تک) میں حجاج اور ثابت کے نسخوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بالفاظ دیگر حجاج کا ترجمہ اقلیدس پوری کتاب (تیرہ یا پندرہ مقالوں تک) پر مشتمل تھا، مگر کارادی فو نے اصل ماخذوں کے بجائے مختلف کتب خانوں کی فہرستوں پر اعتماد کیا، اور چونکہ لیڈن کی فہرست میں لکھا تھا کہ وہاں اس کے پہلے چھ مقالے موجود ہیں، اس سے یہ اس نے حکم لگا دیا کہ حجاج نے صرف پہلے چھ مقالوں ہی کا ترجمہ کیا تھا،

اقلیدس کا چوتھا ترجمہ اسحاق بن حنین (المتوفی ۲۹۸ھ) نے کیا اور مشہور مترجم ثابت بن قرہ نے بعد میں اس پر اصلاح دی۔ ابن الندیم لکھتا ہے:

ونقله اسحق بن حنين و اصلحه ثابت بن قرة الحراني[3]

بعد میں اقلیدس کو اسحق بن حنین نے یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا اور ثابت بن قرہ نے اس پر اصلاح دی،

اس ترجمہ کا ایک کمل اور ناقص نسخہ بوڈلین لائبریری میں موجود ہے (نمبر ۲۷۹ اور ۲۸۰)۔ ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں بھی ہے۔

[1] تحریر اصول اقلیدس مطبوعہ طہران ص ۲ [2] ایضاً ص ۱۵۴ [3] الفہرست ص ۳۷۱

پانچواں ترجمہ ثابت بن قرہ نے کیا تھا، ابن الندیم ثابت بن قرہ کے مستقل ترجمہ کا ذکر نہیں کرتا صرف اسحاق کے ترجمہ پر اس کی اصلاح کا ذکر کرتا ہے، لیکن ابن القفطی نے لکھا ہے کہ ثابت نے اقلیدس کے دو ایڈیشن مرتب کیے: ایک اسحاق بن حنین کے ترجمہ کی اصلاح اور دوسرا اپنا مستقل ترجمہ،

واصلح کتاب اقلیدس ونقله ایضاً الی العربی اصلاحین الثانی من خیر الاول[1]

ثابت نے (اسحٰق کے ترجمۂ) اقلیدس کی اصلاح کی اور اسے عربی میں بھی ترجمہ کیا، دوسرا پہلے سے بہتر ہے۔

محقق طوسی بھی نہ تو اسحٰق کے ترجمہ کا نام لیتا ہے اور نہ اس پر ثابت بن قرہ کی اصلاح کا ذکر کرتا ہے بلکہ ثابت کے مستقل ترجمہ کا ذکر کرتا ہے، اس کا قول اوپر گزر چکا ہے، جس میں وہ حجاج کے نسخہ کے ساتھ ثابت کے نسخہ کا ذکر کرتا ہے۔ دوسری جگہ وہ کہتا ہے:

وافرز ما یوجد من اصل الکتاب فی نسختی الحجاج وثابت عن المزید علیه[2]

اور میں اصل اقلیدس کو جو حجاج اور ثابت کے نسخوں میں ہے بعد کے اضافوں سے علٰحدہ کرونگا۔

ابن القفطی کے اس قول کی تائید کہ ثابت نے مستقلاً اصول اقلیدس کا ترجمہ کیا تھا جیرارڈ کریمونائی (Gherard of Cremona) (۱۱۱۴ء - ۱۱۸۷ء) کے ترجمۂ اقلیدس سے بھی ہوتی ہے۔ جیرارڈ نے جس عربی اصل سے یہ ترجمہ کیا تھا، وہ ثابت کے مستقل ترجمہ کا تنقیدی اڈیشن تھا اور اس کے مرتب کے پیش نظر ثابت کا مستقل ترجمہ تھا، کیونکہ وہ بار بار "ثابت کا ترجمہ (Translatio Thebit) اور ثابت کا عربی میں ترجمہ" (Thebit qui transtulit hunc librum in arabicum linguam") کہتا ہے[3]:-

اقلیدس کے "ترجمۂ منصوری" کی طرح حجاج کے دونوں ترجمے بھی، اقلیدس کی یونانی اصل سے ماخوذ تھے، اسی طرح اسحاق اور ثابت بن قرہ کے تراجم کی اصل بھی یونانی اقلیدس ہے، چنانچہ ٹی، ایل، ہیتھ

---

[1] اخبار الحکما، با خبار الحکما، ص ۸۴ [2] تحریر اصول اقلیدس ص ۲ [3] Thirteen books of Euclid by T.L Hearth pag 94

لکھتا ہے کہ اسحٰق نے براہ راست یونانی سے اقلیدس کا ترجمہ کیا تھا۔

"There seems to be no doubt that Ishaq who must have known Greek as well as his father, made his translation direct from the Greek."[1]

یعنی [اس بات میں کوئی شک معلوم نہیں ہوتا کہ اسحٰق جو اپنے باپ کی طرح یونانی زبان جانتا تھا اس نے اپنا ترجمہ یونانی سے کیا تھا]

اسی طرح وہ ثابت کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے اسحاق کے ترجمہ کی اصلاح اقلیدس کی یونانی اصل کی مدد سے کی تھی،

"Thabit undoubtedly consulted Greek Mass for the purpose of his revision. This is expressly stated in a marginal note to a Hebrew version of the Elements made from Ishaq."[2]

یعنی [ثابت نے اسحاق کے ترجمۂ اقلیدس کی اصلاح کے واسطے یقیناً یونانی مخطوطات کا مطالعہ کیا تھا، اسحاق کے عربی ترجمہ سے جو عبرانی ترجمہ کیا گیا تھا اس کے حاشیہ پر یہ بات بالتصریح مذکور ہے]

اور ثابت نے اپنا مستقل ترجمہ بھی یونانی اصل ہی سے کیا تھا، چنانچہ محقق طوسی نے نویں مقالے کی اکتیسویں شکل کے متعلق لکھا ہے:

وروی عن ثابت ان هذا الشکل والذی قبله لم یکونا فی النسخ الیونانیة[3]

ثابت سے مروی ہے کہ یہ شکل اور اس سے پہلے والی شکل یونانی نسخوں میں نہیں تھیں

---

[1] Thirteen book of Euclid by T.L Heath [2] ایضاً [3] تحریر اصول اقلیدس ص ۱۲۶

ان پانچ ترجموں کے علاوہ اقلیدس کے تین اور ترجموں کا بھی ذکر ملتا ہے، مگر انھیں قبول عام کا درجہ حاصل نہ ہوسکا، ان کے مترجم نظیف رومی، یوحنا القس اور ابو عثمان دمشقی تھے، نظیف اور یوحنا القس کے ترجموں کے سلسلے میں ابن الندیم لکھتا ہے:-

وذکر نظیف المتطبب انه رای	طبیب نظیف نے ذکر کیا ہے کہ اس نے رومی زبان
المقاله العاشرة من اقلیدس	میں اقلیدس کا دسواں مقالہ دیکھا تھا جس میں
رومیة وهی تزید علی مافی ایدی	متداول مقالے سے جو عام طور پر پایا جاتا ہے چالیس
الناس اربعین شکلا والذی بایدی	شکلیں زیادہ تھیں، متداول مقالے میں ایک سو نو
الناس مائة وتسعة اشکال وانه	شکلیں ہیں، اس نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس نے
عزم علی اخراج ذلک الی العربی	اسے عربی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور
وذکر یوحنا القس انه رای الشکل	یوحنا القس نے ذکر کیا ہے کہ اس نے وہ شکل دیکھی
الذی ادعاه ثابت فی المقالة الاولی	تھی جس کے متعلق ثابت بن قرہ نے پہلے مقالہ میں
وزعم انه فی الیونانی۔ وذکر	دعوی کیا ہے اور گمان کیا ہے کہ وہ یونانی اصل میں
نظیف انه اراه ایاه ۱؎	موجود ہے، نظیف نے بھی ذکر کیا ہے کہ اس نے اسے شکل دکھائی تھی

غالباً اس اقلیدس رومیہ کا عربی میں ترجمہ ہوا خواہ نظیف نے کیا ہو یا کسی اور نے اور اس ترجمہ کے کچھ اجزاء پیرس کی قومی لائبریری میں موجود ہیں، ان میں سے ایک جزء کے اندر یہ تصریح ہے:-

"مقالہ عاشرہ کی بعض اشکال میں کچھ اضافے جو یونانی اقلیدس میں نہیں ہیں۔"

ابو عثمان دمشقی کے ترجمۂ اقلیدس کے بارے میں ابن الندیم لکھتا ہے:

ونقل ابو عثمان الدمشقی منه	ابو عثمان دمشقی نے اقلیدس کے متعدد مقالوں
مقالات رأیت منها العاشرة	کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، ان میں سے دسواں مقالہ

۱؎ الفہرست ص ۳۷۱

بالموصل فی خزانة علی بن احمد	میں نے موصل میں علی بن احمد العمرانی
العمرانی ۱؎	کے کتب خانہ میں دیکھا تھا۔

غالباً ابو عثمان دمشقی کا ترجمہ ببس (Pappus) کے شرح مقالۂ عاشرہ کا ترجمہ تھا، ابو عثمان کا یہ ترجمہ پیرس کی قومی لائبریری میں موجود ہے۔

اصول اقلیدس کی اصلاح و تحریر

اصول اقلیدس کی تہذیب و اصلاح اور ترتیب و تحریر کے سلسلے میں سب سے پہلا نام فیلسوف العرب کندی کا آتا ہے، اس نے اصول اقلیدس کی اصلاح "رسالہ فی اصلاح کتب اقلیدس" ۲؎ کے عنوان سے اور حکیم ابسقلاؤس (Hypsicles) کے ملحقات (چودہویں اور پندرہویں مقالے) کی اصلاح "رسالہ فی اصلاح المقالة الرابعة عشر والخامسة عشر من کتاب اقلیدس" ۳؎ کے نام سے کی، کندی کے بعد ثابت بن قرہ نے "کتاب فی اشکال اقلیدس" ۴؎ لکھی جس میں غالباً اشکال اقلیدس کو نئی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا تھا،

چوتھی صدی میں ابو جعفر الخازن نے مصادرات کو بڑی خوبی سے ترتیب دیا، مگر اس میں اشکال کی ترتیب بدل گئی،

اس کے بعد ابو الوفاء البوزجانی نے اقلیدس کو نئے اضافوں کے ساتھ از سر نو مرتب کیا جن میں سے بعض اضافوں کے متعلق اہل فن کا خیال ہے کہ غیر ضروری ہے،

اسی زمانہ میں استاذ المحقق ابو عبد اللہ النسوی نے اصول اقلیدس کو "التجرید" کے نام سے مرتب کیا، اس کے آٹھ مقالے رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں،

چوتھی صدی کے آخر میں شیخ بو علی سینا نے اقلیدس کا جو اڈیشن مرتب کیا اس میں بہت سے حدود و مصادرات کو حذف کر دیا، لیکن آج ان اڈیشنوں کے نام ہی نام باقی ہیں کیونکہ محقق طوسی کی تحریر اقلیدس کے سامنے وہ سب ماند پڑ گئے، محقق طوسی نے ساتویں صدی کے وسط میں حجاج اور ثابت کے ترجموں کی مدد سے اقلیدس کا وہ اڈیشن

۱؎ الفہرست ص ۳۷۱ ۲؎ عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۱ ص ۲۱۱ ۳؎ ایضاً ج ۱ ص ۲۱۱ ۴؎ ایضاً ج ۱ ص ۲۱۹

مرتب کیا جو آج تک مدارس عربیہ میں مروج ہے، وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

فلما فرغت عن تحریر المجسطی رأیت	جب میں المجسطی کو ایڈٹ کرنے سے فارغ ہوا تو میں نے
ان احرر کتاب اصول الھندسة	مناسب سمجھا کہ اصول اقلیدس کو ایڈٹ کروں
.... واضیف الیه ما یلیق به	.... اور اس میں ضروری اضافے کروں ....
وافرز ما یوجد من اصل الکتاب فی	اور حجاج اور ثابت کے نسخوں میں جو اصل ترجمہ ہے
نسختے الحجاج والثابت عن المزید علیه[1]	اسے بعد کے اضافوں سے ممتاز کر دوں ۔

مستشرقین کا خیال ہے کہ محقق نے اپنے ایڈیشن کے دو نسخے مرتب کیے تھے، ایک بڑا اور چھوٹا، بڑا نسخہ کہا جاتا ہے صرف فلورینس میں ہے (Pall 272 پلیج 313) جو ۱۵۹۴ء میں بمقام روم چھاپا گیا تھا، مگر اس کے مطبوعہ نسخے بھی کمیاب ہیں، چھوٹے نسخے کے مخطوطات ہندوستان اور یورپ کی تقریباً تمام لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں، یہ نسخہ ۱۸۰۱ء میں بمقام قسطنطنیہ اور ۱۲۹۸ھ میں بمقام طہران چھاپا گیا،

اسی زمانہ میں (ساتویں صدی ہجری میں) محی الدین یحییٰ بن ابی الشکر المغربی نے اقلیدس کا ایک ایڈیشن بعنوان "تحریر اقلیدس فی اشکال الھندسة" مرتب کیا، اسکا ایک نسخہ جامع ایا صوفیا میں موجود ہے۔

اصول اقلیدس کے فارسی تراجم | اصول اقلیدس کا سب سے قدیم فارسی ترجمہ غالباً وہ ہے جو علامہ قطب الدین شیرازی (المتوفی ۷۱۰ھ) نے کیا تھا، اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے، فارسی میں اقلیدس کا دوسرا مشہور ترجمہ مرزا خیر اللہ مہندس کا ہے، جو انھوں نے ۱۱۴۴ھ میں "تقریر التحریر" کے نام سے کیا تھا، اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے،

اقلیدس کا اردو ترجمہ جو جدید ٹکسٹ بکوں سے پہلے ہندوستان کے سرکاری مدارس میں مروج تھا، انگریزی اقلیدس سے کیا گیا تھا، اس لیے وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ (باقی)

---

[1] تحریر اصول اقلیدس ص ۲

امام نسائیؒ اور ان کی سنن

از

جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

(۲)

امام نسائیؒ پر تشیع کا الزام | امام نسائیؒ علم و عمل دونوں اعتبار سے بہت بلند تھے، ان کی زندگی علم و فضل کی طرح زہد و تقویٰ سے بھی آراستہ تھی، مگر اس کے باوجود ان کی جانب کچھ ایسی باتیں منسوب کیجاتی ہیں جو انکی بلند شخصیت کے منافی ہیں، ان پر سب سے بڑا اور اہم الزام تشیع کا لگایا جاتا ہے، جو سراسر غلط ہے، مشہور اور محتاط اصحاب سیر و رجال نے اس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے، چنانچہ علامہ ذہبی، ابن سبکی اور حافظ ابن حجر وغیرہ اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہیں،

اس الزام کو شہرت غالباً ابن خلکان کے ایک بیان سے ہوتی ہے، چنانچہ ابن جوزی نے المنتظم میں ابن عماد نے شذرات میں اور نواب صدیق حسن صاحب نے الحطہ میں اسے نقل کر دیا ہے، البتہ علامہ ابن کثیر کا بیان کسی قدر مختلف ہے، مگر در اصل ان کا دار و مدار ابن خلکان ہی کی روایت پر معلوم ہوتا ہے، اس لیے ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ ابن خلکان کا پورا بیان یہ ہے:

قال محمد بن اسحاق الاصبهانی	محمد بن اسحاق اصبہانی فرماتے ہیں کہ میں نے
سمعت مشایخنا بمصر یذکرون	مصر میں اپنے استادوں سے سنا ہے کہ ابو عبد الرحمن
ان ابا عبد الرحمن فارق مصر فی	آخر عمر میں مصر چھوڑ کر دمشق چلے گئے وہاں ان سے

آخر عمرہ وخرج الی دمشق فسئل عن معاویۃ وما روی فی فضائلہ فقال اما یرضی معاویۃ ان یخرج رأسا برأس حتی یفضل وفی روایۃ اخری ما اعرف لہ فضیلۃ الا لا اشبع اللہ بطنہ وکان یتشیع فما زالوا یدفعون فی حضنہ حتی اخرجوہ من المسجد وفی روایۃ اخری یدفعون فی خصیہ[1]

حضرت معاویہؓ اور ان کے فضائل سے متعلق روایات کے بارہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ کیا معاویہ کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ سربسر نجات پا جائیں، ان کے فضائل ہی کہاں جو بیان کیے جائیں، ایک دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے جواب دیا کہ میں ان کی کوئی فضیلت اس کے علاوہ نہیں جانتا کہ "اللہ اسکے پیٹ کو آسودہ نہ کرے"۔ اور وہ حضرت علیؓ کے حامی تھے، لوگوں نے یہ جواب سنکر انکی کمر اور کوکھ میں مارنا شروع کیا اور مسجد سے نکالدیا، دوسری روایت میں ہے کہ ان کے خصیتین پر اتنا مارا کہ وہ زخمی ہو گئے

اولاً اس روایت کی صحت ہی محل نظر ہے، متقدمین میں سے کسی نے اس کو نہیں لکھا ہے اور نہ اس کی سند مسلسل ہے۔ اور ابن خلکان اور امام نسائیؒ کے درمیان کئی صدیوں کا فرق ہے، امام نسائیؒ کا انتقال ۳۰۳ھ میں ہوا ہے، اور ابن خلکان کا ۶۸۱ھ یعنی دونوں کے درمیان تقریباً چار صدیوں کا فرق ہے، ایسی حالت میں امام نسائیؒ کے بارہ میں ابن خلکان کی روایت بغیر کسی سند کے کیسے قبول کیجا سکتی ہے،

اور اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے صرف اسقدر ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائیؒ حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، یا ان کو ان کے فضائل کی روایات کا علم نہ تھا، حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل کا انکار تشیع نہیں ہے، بہت سے اکابر کا یہ مسلک رہا ہے، پھر ابن خلکان نے "کان شیعیا" نہیں بلکہ "کان یتشیع" لکھا ہے، یعنی ان میں شیعیت کا اثر تھا،

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵، ۳۶

اس روایت کی صحت کی صورت میں واقعہ کی شکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ شام بنی امیہ کا مرکز حکومت رہ چکا تھا اور امیر معاویہؓ کا سب سے سنگین قلعہ تھا، یہاں کے تمام قبائل حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کے حامی و مددگار تھے، اس لیے بنی امیہ کی حکومت مٹنے کے بعد بھی مدتوں یہ اثر قائم رہا اور امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلاف کی صدائے بازگشت صدیوں آتی رہی، امام نسائیؒ کے زمانہ میں بھی یہی صورت حال رہی جیسا کہ خود اہل شام کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے امام موصوف نے اسکی اصلاح اور حضرت علیؓ سے ان لوگوں کا سوء ظن دور کرنے کے لیے یہ جواب دیا، مگر ان کے دل و دماغ پر امیر معاویہؓ کا اتنا اثر تھا کہ وہ آمادہ پیکار ہوگئے، اور اس کے جواب میں امام صاحب کی توہین میں بھی باک نہیں کیا اور ان پر شیعیت کا الزام لگا دیا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں :-

وسبب موت او آنست کہ چوں از تصنیف مناقب مرتضوی رضی اللہ عنہ فارغ شد خواست کہ ایں کتاب را در جامع دمشق برملا بیان کند تا مردم آنجا کہ بسبب طول سلطنت بنی امیہ میل بمذہب نواصب پیدا کردہ بودند مہتدی شوند قدرے ازاں کتاب مذکور کردہ بود کہ سائلے گفت کہ در مناقب امیر المومنین معاویہ نیز چیزے نوشتہٗ نسائی گفت کہ معاویہ را ہمیں بس است کہ سر بسر نجات یابد او را مناقب کجاست

امام نسائیؒ کی موت کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ حضرت علیؓ کے مناقب لکھکر فارغ ہوئے تو چاہا کہ جامع مسجد دمشق میں لوگوں کے سامنے اس کتاب کو بیان کریں تاکہ وہاں کے لوگ بنی امیہ کی مدت مدید تک وہاں سلطنت کے باعث جو نواصب کے مذہب کی طرف مائل ہوگئے ہیں، ہدایت یافتہ ہو جائیں، اس کتاب کا تھوڑا ہی حصہ بیان کیا تھا، کہ ایک شخص نے پوچھا کہ امیر المومنین معاویہ کے فضائل بھی آپ نے کچھ تحریر کیا ہے، امام نسائیؒ نے کہا، معاویہ کے لیے تو اتنا بس ہے کہ انھیں سربسر نجات مل جائے

و بعضے گویند کہ ایں کلمہ ہم گفت کہ نزد من از	ان کے فضائل ہی کہاں ہیں، بعض کہتے ہیں کہ
مناقب او ہیچ صحیح نشدہ مگر حدیث لا اشبع	آپ نے یہ بات بھی فرمائی تھی کہ میرے نزدیک ان کے
اللہ بطنہ، عوام مردم او را بتشیع تہمت کردند	مناقب میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے، سوائے
..... وچند ضربہ شدید بخصیتین او رسید کہ بہ سبب	لا اشبع اللہ بطنہ کے۔ (یہیں سے) عوام الناس
ان نیم جاں شد[1]	نے ان پر تشیع کا الزام جڑ دیا...... اور چند ضربیں

ابن خلکان کے مقابلہ میں ابن کثیر کا بیان ملاحظہ ہو، اگرچہ ان کا دار و مدار بھی ابن خلکان ہی کی روایت ہے، مگر ان کا پیرایۂ بیان مختلف ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

وقد قیل عنہ: انہ کان ینسب	ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انکی طرف کچھ
الیہ شئ من التشیع	شیعیت بھی منسوب ہے۔

اس کے بعد انھوں نے وہی ابن خلکان کی روایت نقل کی ہے، مگر "قیل" کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ انتساب و الزام ابن کثیر کے نزدیک مشکوک اور مشتبہ ہے۔ کیونکہ "قیل" کہکر جو بات کہی جاتی ہے وہ کمزور ہوتی ہے۔ "کان ینسب الیہ" میں صیغۂ مجہول کا استعمال بھی بتاتا ہے کہ راوی کے نزدیک الزام غیر محقق ہے، اور "شئ من التشیع" سے جس تقلیل کا اظہار ہوتا ہے وہ بھی قابل غور ہے

غرض ابن کثیر کے نزدیک امام نسائی کی جانب شیعیت کا انتساب ہر حیثیت سے نہایت ضعیف ہے،

ان باتوں سے قطع نظر امام نسائی کے شیعہ نہ ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ سے فرط عقیدت کے باوجود دوسرے صحابہ کے فضائل و کمالات کے بھی قائل تھے، اور مسائل میں ان کے عمل سے استفادہ کرتے تھے، جیسا کہ ان کی سنن سے ظاہر ہے، شیعہ سب سے زیادہ شیخین (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کو مطعون کرتے ہیں، مگر امام نسائی ان کے آراء و اقوال سے حجت و استدلال قائم کرتے ہیں۔

[1] بستان المحدثین ص ۱۱۱

کتاب البیوع میں ایک روایت نقل کی ہے:۔

..... قال ابن ابی اوفی نسلف	..... ابن ابی اوفی کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ
علی عھد رسول اللہ صلی اللہ	اور ابوبکر و عمر کے زمانے میں گیہوں، جو اور
علیہ وسلم وابی بکر وعمر	کھجور میں بیع سلم ایسے لوگوں سے کرتے تھے
فی البر والشعیر والتمر الی	جن کے متعلق مجھے نہیں معلوم کہ وہ چیزیں
قوم لا ادری آعندھم ام لا[1]	ان کے پاس ہوتی تھیں یا نہیں۔

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

قضی بذلک ابوبکر وعمر[2]	ابوبکر و عمر نے یہ فیصلہ کیا ہے۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:۔

قضی بذلک ابوبکر وعمر و	اس چیز کا ابوبکر و عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم)
عثمان[3]	نے فیصلہ کیا ہے۔

کیا اس کے بعد بھی شیعیت کی گنجایش رہ جاتی ہے،

البتہ اس سلسلہ میں دو باتیں قابل بحث ہو سکتی ہیں، ایک حضرت علیؓ کی محبت و عقیدت میں غلو، دوسرے حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق سخت الفاظ کا استعمال،

پہلے کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی محبت میں کوئی ایسا غلو ناپسندیدہ نہیں ہے، جو شریعت کے خلاف نہ ہو بلکہ محبت اہل بیت تو ایمان کا جزء ہے، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک تھا۔ جدید مصری عالم ابوزہرہ نے امام احمدؒ کی حضرت علیؓ سے عقیدت کے سلسلہ میں بڑی عمدہ بات لکھی ہے،

"اس معاملہ میں ان کا وہی مسلک تھا جو ان کے شیخ امام شافعی کا تھا۔ امام شافعی حضرت علیؓ

[1] سنن نسائی ج ۲ ص ۲۲۶ [2] ایضاً ۲۳۲ [3] ایضاً ص ۲۳۳

کے فضائل ومناقب روایت کرتے تھے، اور ان سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ کے مقابلہ میں جب تفضیل کا سوال آتا تھا تو وہ حضرت ابوبکرؓ کو سب پر ترجیح دیتے تھے، ان کا قول ہے کہ "معاملہ ہمارے جذبات کے تابع نہیں ہے"۔[1]

امام شافعیؒ ہی کی طرف یہ شعر بھی منسوب ہے:

ان کان رفضا حب آل محمد فلیشھد الثقلان انی رافض

(اگر اہل بیت سے محبت کرنا ہی شیعیت ہے، تو جن وانس دونوں گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں)

حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں امام نسائیؒ کے الفاظ البتہ سخت ہیں، حضرت امیر معاویہؓ بہرحال صحابی ہیں جن کے متعلق ارشاد نبوی موجود ہے، اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم وغیرہ۔

مگر اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔

(۱) حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی فضیلت مسلّم ہے، ان کو کسی طرح حضرت علیؓ کے ہم پایہ نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ جمہور امت کا متفقہ فیصلہ ہے، امام نسائیؒ نے شام میں لوگوں کو اسکے برخلاف دیکھا تو جناب امیرؓ کے فضائل ومناقب بیان کرنے میں غلو سے کام لیا، اور اس سلسلہ میں غیر شعوری طور پر جناب معاویہؓ کی نسبت بعض سخت الفاظ نکل گیے۔

(۲) امام نسائیؒ نے امیر معاویہؓ کے متعلق جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان میں وہ منفرد نہیں ہیں، بعض دوسرے ائمہ بھی اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے،

(۳) امام نسائیؒ کو حضرت علیؓ سے غیر معمولی عقیدت ومحبت تھی، مگر جب وہ شام گئے تو وہاں آپ کے خلاف سوءظن دیکھکر آپ کے فضائل ومناقب بیان کرنا شروع کر دیے جو بنی امیہ کے حامیوں کو ناگوار ہوئے اور انھوں نے امام نسائیؒ سے امیر معاویہؓ کے فضائل بیان کرنے کی خواہش

[1] احمد بن حنبل ترجمہ مولوی رئیس احمد جعفری ص ۳۴۳

کی، امام صاحب نے یہ سمجھا کہ جناب امیرؓ سے بدگمانی کا اصل سبب امیر معاویہؓ سے فرط عقیدت وشیفتگی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ان کی شان میں مذکورہ بالا باتیں کہہ دیں جن سے ان کا منشا امیر معاویہؓ کی مذمت نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے ثابت کرنا تھا،

(۴) حافظ ابن حجرؒ وغیرہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نسائیؒ کے نزدیک امیر معاویہؓ کے فضائل ومناقب میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں، اس لیے انھوں نے نہیں بیان کیا اور جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو غصہ میں آپ کی زبان سے بعض سخت الفاظ نکل گئے اور غیظ وغضب کی حالت میں جو الفاظ منھ سے نکل جاتے ہیں، ان کا اعتبار نہیں،

سنن نسائی امام نسائیؒ کا سب سے بڑا علمی اور دینی کارنامہ سنن کی تالیف ہے، اسی کتاب کے ذریعہ انکے محدثانہ شان اور تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے، اور اسی کی بدولت آج تک ان کا نام زندہ ہے، اس لیے اس کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تعارف کرایا جاتا ہے،

امام نسائیؒ کی سنن میں دو تصنیفات ہیں، سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ لیکن صحاح ستہ میں سنن صغریٰ شامل ہے، جس کا دوسرا نام مجتبیٰ ہے، مشہور یہ ہے کہ امام صاحب جب سنن کبریٰ کی تصنیف وتالیف سے فارغ ہو چکے تو رملہ کے امیر نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کی یہ پوری کتاب صحیح ہے؟ آپ نے جواب دیا نہیں، صحیح اور حسن دونوں کا مجموعہ ہے، امیر نے التماس کی کہ آپ میرے لیے اس میں سے اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیثیں الگ کر دیجئے، آپ نے اس درخواست پر ایک دوسری کتاب تیار کی جس کا نام "مجتبیٰ" رکھا، جو سنن نسائی کے نام سے مشہور ہے،

"سنن کبریٰ" اور "سنن صغریٰ" دونوں کے راوی مختلف ہیں، اول الذکر کا راوی ابن الاحمر اور موخر الذکر کا ابن السنی ہے، دونوں کا مختصر حال یہ ہے،

ابن الاحمر ان کا اصل نام محمد، ابو بکر کنیت، باپ کا نام معاویہ اور دادا کا نام عبد الرحمٰن تھا، اموی خاندان سے نسبی تعلق تھا، قرطبہ کے رہنے والے اور اندلس کے بلند ترین محدثین میں شمار کیے جاتے تھے، عبید اللہ بن یحییٰ اور بہت سے افاضل سے روایتیں کی ہیں اور طلب علم کی راہ میں جب سفر کیا تو امام نسائی، فریابی اور ابو خلیفہ جمحی وغیرہ سے بھی روایات کیں، حدیث کا خاص ذوق رکھتے تھے، اور بڑے ثقہ وضابط تھے، کبیر کے راوی ہیں، تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے، مگر سارا اثاثہ جس کی قیمت ۳۰ ہزار دینار کے قریب تھی، غرق ہوگیا، اور وطن واپس ہو کر تہی دستی میں رجب ۳۵۸ھ میں انتقال کیا، [1]

ابن السنی ان کی کنیت ابو بکر، نام احمد، سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن محمد بن اسحٰق بن ابراہیم ابن اسباط دینوری، یہ جعفر بن ابو طالب ہاشمی کے غلام تھے، علم حدیث سے خاص ذوق تھا، اس کے لیے دور دراز مقامات کا سفر کیا، ان کے اساتذہ میں امام نسائی، ابو خلیفہ جمحی، زکریا ساجی، عمر بن ابی غیلان، باغندی، ابو یعقوب منجنیقی، جماہر بن محمد زملکانی، عبد اللہ بن زیدان البجلی اور ابو عروبہ حرانی اور تلامذہ میں احمد عبد اللہ اصبہانی، محمد بن علی علوی، علی بن عمر اسد آبادی اور احمد بن حسین لکسا وغیرہ ہیں، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن سنی نہایت متدین، مخیر، عادل اور صادق تھے، سنن صغریٰ کے راوی اور مشہور کتاب عمل الیوم واللیلۃ اور بعض دوسری کتابوں کے مصنف ہیں، وفات کے وقت ۸۰ سال سے کچھ زیادہ عمر تھی، قاضی ابو زرعہ کا بیان ہے کہ میرے چچا علی بن احمد بن محمد فرماتے تھے کہ میرے والد حدیث نبوی لکھ رہے تھے، اور قلم دوات میں ڈال کر خدا سے دعا کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں انتقال ہوگیا، سال وفات ۳۶۴ھ ہے، [2]

کتب حدیث میں سنن کا مقام یہ صحیح ہے کہ جو مقبولیت صحیح بخاری اور مسلم کو حاصل ہوئی وہ صحاح کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوئی اور ترتیب میں نسائی کو ابوداؤد اور ترمذی کے بعد جگہ دی گئی ہے،

۱؎ شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۷ ، ۲؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۱

لیکن اس کا نام ابوداؤد اور ترمذی کے ساتھ ساتھ آتا ہے، اس لیے یہ بھی ان کے ہم پایہ اور ہم مرتبہ ہے، اور اس کا صحاح میں شامل ہونا ہی اس کی اہمیت اور عظمت کے لیے کافی ہے، لیکن جس طرح بعض خصوصیات میں صحاح کی ہر کتاب دوسری کتابوں پر فائق ہے، اسی طرح نسائی کی بھی بعض خصوصیات دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

بعض محدثین کا خیال ہے کہ صحیحین کے بعد اسی کا درجہ ہے، اسلیے کہ اس میں سب سے کم ضعیف روایات اور مجروح رجال ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اسے دوسری کتابوں کی سی شہرت نہ حاصل ہوسکی، مگر اس کی صحت میں شبہہ نہیں، نسائی کے شرائط اور قبول روایت کے معاملہ میں تشدد مشہور ہے، جرح و تعدیل کے ماہرین اور نقادوں کا فیصلہ ہے کہ ان لابی عبد الرحمٰن شرطاً فی الرجال اشد من شرط البخاری[1]، اس لیے یہ انکشاف قطعاً حیرت انگیز نہیں ہے کہ صحیحین کے بعد اسکا درجہ ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے کتب حدیث کو صحت و شہرت کے اعتبار سے چار طبقات میں شمار کیا ہے، ان کی تشریح کی روشنی میں سنن کے حسب ذیل خصائص اور مراتب معلوم ہوتے ہیں:

(۱) نسائی کا شمار اگرچہ صحاح میں ہے لیکن وہ موطا امام مالک اور صحیحین سے فروتر ہے۔

(۲) سنن نسائی جامع ترمذی اور ابوداؤد کے ہم پایہ اور ہم مرتبہ ہے۔

(۳) امام نسائی کی ثقاہت و عدالت، ضبط و حفظ اور رسوخ و تبحر دوسرے اصحاب کی طرح مسلم ہے،

(۴) امام نسائی اپنی شرطوں میں تساہل اور تہاون سے کام نہیں لیتے۔

(۵) نسائی کو صحاح کی دوسری کتابوں کی طرح بڑی مقبولیت حاصل ہے، کیونکہ محدثین اور فقہانے ہر زمانہ میں اس کی حدیثوں سے اعتنا کیا ہے، اہل علم نے غریب حدیثوں کی شرح، رجال کی تحقیق و تفتیش اور اس سے عام فقہی مسائل مستنبط کیے ہیں۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸

(۶) عام علوم شرعیہ کا اس پر مدار اور محدثین و فقہاء کا اس پر اعتماد و اعتبار رہے۔

(۷) اس کی روایات متعدد طرق سے مروی ہونے کی وجہ سے مشہور اور مستفیض ہیں۔

(۸) جمہور فقہاء اور علماء حرمین کی روایات پر عمل کرنے میں متفق یا کم از کم وہ صحابہ و تابعین کی ایک کثیر جماعت یا کسی بڑے مقام کے لوگوں کی معمول بہ ہیں،[1]

سنن کا ایک عام سرسری جائزہ | روایت حدیث کا تمام تر دار و مدار اسناد اور رواۃ پر ہے۔ اس لیے اس جائزہ میں اس پہلو کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا ہے، ہمارے پیش نظر سنن کا وہ نسخہ ہے جو مصر کے مطبعہ میمنہ سے ۱۳۱۲ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوا ہے اور اس کے ساتھ سیوطی کی شرح اور سندھی کا حاشیہ بھی ہے، اس لیے آیندہ حوالے اسی کے ہوں گے۔

کتب حدیث کی تبویب و ترتیب بھی عام کتب فقہ کی طرح ہوئی ہے، امام نسائی نے اسی اصول کو ملحوظ رکھا ہے، مگر عام محدثین اور ان کے درمیان ابواب کی تقدیم و تاخیر میں کسی قدر اختلاف ہے اور دقت نظر سے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نسائی کی ترتیب و تبویب دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ موزوں اور انسب ہے، بعض دوسرے جلیل القدر محدثین نے ابواب کی ترتیب میں موزونیت کا خیال نہیں رکھا ہے۔ مثلاً امام ابو داؤد نے کتاب الزکوٰۃ کے بعد کتاب اللقطہ کو اس کے بعد کتاب الحج کو، کتاب الحج کے بعد کتاب النکاح و الطلاق اور اس کے بعد کتاب الصیام کو رکھا ہے، امام ترمذی نے کتاب الحج کے بعد ابواب الجنائز اور اس کے بعد کتاب النکاح کو رکھا ہے، اسی طرح ابواب البر والصلہ کے بعد ابواب الطب اس کے بعد انھوں نے ابواب الفرائض اور ابواب الوصایا کو رکھا ہے۔ رئیس المحدثین امام بخاری نے کتاب الحج کے بعد کتاب الصوم اور اس کے بعد کتاب البیوع کو رکھا ہے، اور کتاب المغازی کے بعد کتاب التفسیر اور اس کے بعد کتاب النکاح لائے ہیں، لیکن امام نسائی کے یہاں اس طرح کی بے ترتیبی اور عدم موزونیت بہت کم نظر آتی ہے۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج اول ص ۵۔۱۰۸۔

امام نسائی نے بعض ایسے ابواب قائم کیے ہیں جو دوسری کتب حدیث میں نہیں ملتے۔ مثلاً کتاب الخیل، کتاب الاحباس، کتاب عشرۃ النساء، اور کتاب الزینۃ وغیرہ۔

رواۃ کا تعارف | امام نسائی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اہل روایت کے اسماء وغیرہ کی پوری تشریح اور تعارف کرا دیتے ہیں، اس کی کئی صورتیں ہیں

(۱) بعض روایتوں میں راوی کے اصل نام کے بجائے صرف کنیت کا ذکر ہوتا ہے، امام نسائی ایسے موقع پر اس کا اصل نام بھی بتا دیتے ہیں جیسے:

قال ابو عبد الرحمٰن ابو معمر اسمہ عبد اللہ ابن سنجرۃ (سنن ج ۱ ص ۱۳۰)

قال ابو عبد الرحمٰن ابو عمار اسمہ عریب بن حمید (ایضاً ص ۲۴۰)

ایک مقام پر دو راویوں کے متعلق فرماتے ہیں:

قال ابو عبد الرحمٰن اسم ابی سلام ممطور وھو حبشی واسم ابی امامۃ صدی ابن عجلان (ج ۲ ص ۱۲۸)

قال ابو عبد الرحمٰن ھذا ابو المتوکل اسمہ علی بن داؤد (ج ۲ ص ۳۲۴)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

قال ابو عبد الرحمٰن ابو کثیر اسمہ یزید بن عبد الرحمٰن (ج ۲ ص ۳۲۵)

(۲) بعض جگہ اصل نام تو مذکور ہوتا ہے مگر چونکہ باپ کے نام کو زیادہ شہرت ہوتی ہے اور راوی کی شہرت بھی اسی سے ہوتی ہے، اس لیے اس کا بھی ذکر فرماتے ہیں، مثلاً

حدثنا عبد الرحمن ھو ابن مھدی (ج ۱ ص ۱۶۹)

نیز:

حدثنا عمار ھو ابن رزیق (ج ۲ ص ۱۱۶)

حدثنا داؤد وھو ابن عبد الرحمٰن العطار (ج ۲ ص ۲۸۲)

انبأنا عبد اللہ یعنی ابن المبارک (ج ۲ ص ۳۲۳)

عن اسماعیل وھو ابن سمیع (ج ۲ ص ۳۲۷)

(۳) کبھی بیٹے کی شہرت کی بنا پر اس کے ذریعہ باپ کا تعارف کراتے ہیں، مثلاً

عبد اللہ ابن جعفر بن نجیح والد علی بن المدینی (ج ۱ ص ۱۹۴)

محمد بن ابراھیم والد ابی بکر ابن ابی شیبة (ج ۱ ص ۲۵۸)

(۴) کبھی راوی کا اس کی نسبت سے تعارف کرا دیتے ہیں، مثلاً

اخبرنی ابوبکر بن اسحٰق ھو الصاغانی (ج ۲ ص ۱۱۶)

ایک جگہ باپ کے نام اور نسبت دونوں کا ذکر فرماتے ہیں:

قال حدثنا حفص وھو ابن عبد الرحمٰن البلخی (ج ۲ ص ۲۵۱)

(۵) کبھی اصل نام مذکور ہوتا ہے لیکن تعارف میں کنیت کا ذکر فرماتے ہیں، مثلاً

عمرو بن شرحبیل یکنی ابا المیسرة (ج ۱ ص ۳۴۷)

(۶) بعض رواۃ اپنے کسی خاص وصف کی بنا پر مشہور ہوتے ہیں، اس لیے ان کے نام کے ساتھ اس وصف کا تذکرہ کر دیتے ہیں، مثلاً

حدثنا سعید بن شبیب ابو عثمان وکان شیخاً صالحا بطرسوس

یا مثلاً ایک روایت میں ابن ام مکتوم کا تعارف اس طور سے کراتے ہیں کہ

وھو الاعمی الذی عاتبه اللہ عزوجل فی کتابه (ج ۲ ص ۱۱۷)

(۷) اگر ایک نام کے کئی راوی ہوتے ہیں تو اس کی وضاحت فرماتے ہیں، مثلاً

قال ابو عبد الرحمٰن اسمٰعیل بن مسلم ثلاثة ھذا احدھم لا بأس به

واسمٰعیل بن مسلم شیخ یروی عن ابی الطفیل لا بأس به واسمٰعیل بن

مسلم یروی عن الزھری والحسن متروک الحدیث (ج ۲ ص ۱۵)

(۸) ایک مقام پر ایک راوی کے ذکر کے ساتھ ہی اس کے چار بھائیوں کا ذکر کیا ہے:

قال ابو عبد الرحمٰن ابو علی الحنفی ھم اربعة اخوة احدھم ابوبکر و

بشر وشریک وآخر (ج ۲ ص ۱۹۰)

راوی اگر کسی راوی کو چھوڑ دے

اگر روایت کرنے والا کسی راوی کو سند سے حذف کر دیتا ہے تو وہ اس کی توضیح فرماتے ہیں، مثلاً ایک روایت میں منصور کی اعمش سے مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خالفه منصور رواہ عن مجاھد عن ابن عباس ولم یذکر طاؤساً" (ج ۱ ص ۱۳)

مجاہد نے اعمش کی روایت میں طاؤس کے واسطے سے ابن عباس سے یہ روایت کی تھی

قال ابو عبد الرحمٰن لم یذکر مالک عروة بن المغیرة (ج ۱ ص ۲۵)

الا ان بکیراً لم یذکر عبد الرحمٰن (ج ۱ ص ۲۰۴)

روایات میں کمی بیشی

اگر بعض روایتوں میں کسی راوی سے کچھ کمی بیشی ہو جاتی ہے تو اس کی وضاحت بھی فرما دیتے ہیں۔ مثلاً

مشہور روایت ہے کہ "اتی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سباطة قوم فبال قائماً" بعض راویوں نے اس سلسلہ میں آپ کے وضو کے بیان میں مسح علی الخفین کا ذکر کیا ہے، لیکن بعضوں نے اسے حذف کر دیا ہے، امام صاحب فرماتے ہیں:

قال سلیمان فی حدیثه ومسح علی خفیه ولم یذکر منصور المسح (ج ۱ ص ۱۱)

ایک روایت میں تمام اعضاء مغسولہ کا ذکر موجود ہے لیکن رجلین کا نہیں، اسلیے وہ فرماتے ہیں

قال عبد العزیز واخبرنی من سمع ابن عجلان یقول فی ذلک وغسل رجلیه (ج ۱ ص ۲۹)

ایک اور روایت کے متعلق فرماتے ہیں:

وبعضھم یزید علی بعض فی الحدیث (ج ۱ ص ۱۹۵)

حج کے باب میں محصر کے متعلق ایک روایت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

قال شعیب فی حدیثہ وعلیہ الحج من قابل (ج ۲ ص ۲۹)

اسی طرح اگر کوئی راوی سلسلۂ روایت میں کسی راوی کا اضافہ کردے تو امام صاحب اس کی بھی وضاحت فرماتے ہیں، مثلاً

ادخل ابو الزناد بینہ وبین خارجۃ مجالد بن عوف (ج ۲ ص ۱۶۵)

راوی کے انفراد کا ذکر — بعض راوی کسی روایت یا جزو روایت کے بیان کرنے میں منفرد ہوتے ہیں، اس لیے امام صاحب نے سنن میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے، مثالیں ملاحظہ ہوں۔

روایت کے الفاظ میں انفراد کی مثالیں:-

قال ابو عبد الرحمن لا اعلم احداً ذکر فی ھذا الحدیث وتوضئی غیر حماد بن زید وقد روی غیر واحد عن ھشام ولم یذکر فیہ وتوضئی (ج ۱ ص ۵۸)

قد روی ھذا الحدیث غیر واحد لم یذکر احد منھم ما ذکرہ ابن عدی واللہ اعلم (ج ۱ ص ۷۵)

باب رفع الیدین عن الارض قبل الرکبتین میں تحریر فرماتے ہیں:-

لم یقل ھذا عن شریک غیر یزید بن ھارون واللہ تعالیٰ اعلم (ج ۱ ص ۱۶۳)

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

قال ابو عبد الرحمن ثم احدث احراماً ما اعلم احداً قالہ غیر نوح بن حبیب ولا احسبہ محفوظاً واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (ج ۲ ص ۹)

وقد روی ھذا الحدیث غیر واحد عن الزھری فلم یذکر فیہ ما ذکر الولید بن مسلم (ج ۲ ص ۳۰۵)

یا راوی کا کسی حدیث کو مسند روایت کرنے میں انفراد ہو، مثلاً

قال ابو عبد الرحمن لا اعلم احداً اسند ھذا عن عبد اللہ بن الفضل الا عبد العزیز واسمعیل مرسلا (ج ۲ ص ۱۸)

لا اعلم احداً اسند ھذا الحدیث عن الزھری غیر معمر واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (ج ۲ ص ۲۱)

کوئی راوی کسی سے روایت کرنے میں منفرد ہو، مثلاً

قال ابو عبد الرحمن لا اعلم احداً روی ھذا الحدیث عن نافع عن عبد اللہ بن عمر غیر موسیٰ بن الجھنی وخالفہ ابن جریج (ج ۲ ص ۳۴)

کوئی راوی کسی راوی کا نام بیان کرنے میں منفرد ہو مثلاً

قال ابو عبد الرحمن ما اعلم احداً قال فی ھذا الحدیث منصور غیر ابن عدی واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ج ۲ ص ۵۰)

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

قال ابو عبد الرحمن لا اعلم احداً قال فی ھذا الحدیث الاسود غیر ائمہ (ج ۲ ص ۸۹)

اسی انفراد کے باعث روایت میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے، امام صاحب نے اس کا اکثر تذکرہ کیا ہے، ایک مثال ملاحظہ ہو:

وھذا خبر ضعیف لان یحیی بن یمان انفرد بہ دون اصحاب سفیان ویحیی بن یمان لا یحتج بحدیثہ لسوء حفظہ وکثرۃ خطئہ (ج ۲ ص ۳۲۴)

عدم متابعت کا ذکر — ایسے ہی وہ راوی کی عدم متابعت کا بھی تذکرہ کرتے ہیں، اس کی کئی صورتیں ہیں۔

۱۔ کسی خاص فقرہ یا جملہ پر عدم متابعت، مثلاً۔

قال ابو عبد الرحمن لا اعلم احداً تابع علی بن مسھر علی قولہ "فلیرقہ" (ج ۱ ص ۲۲)

قال ابو عبد الرحمن لا نعلم احداً تابع عمر بن یحیی علی قولہ "تصلی علی حمار" (ج ۱ ص ۱۲۱)

۲۔ کسی راوی سے روایت کرنے میں عدم متابعت، مثلاً:

قال ابو عبد الرحمٰن لا اعلم احداً تابع یزید بن خصیفه عن بسر بن سعید علی قوله عن ابی ہریرۃ (ج ۲ ص ۲۸۳)

۳۔ کسی خاص روایت میں راوی کی عدم متابعت، مثلاً

قال ابو عبد الرحمٰن لا نعلم احداً تابع ایمن بن نائل علی ھذہ الروایۃ (ج ۱ ص ۱۸۹)

یا مثلاً

لا اعلم احداً تابع شبابۃ علی ھذا الحدیث (ج ۱ ص ۲۵۲)

اسناد میں عدم متابعت کا ذکر، مثلاً

ما اعلم احداً تابع اللیث علی ھذا الاسناد غیر ابن جریج (ج ۱ ص ۲۰۸)

اسی عدم متابعت کے نتیجہ میں روایات میں ضعف اور سقم پیدا ہو جاتا ہے، امام موصوف نے سنن میں اس کی وضاحت کر دی ہے، مثلاً ایک روایت میں آتا ہے: "لیس من البر الصیام فی السفر"

امام صاحب اس سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

ھذا خطاء الصواب والذی قبلہ لا نعلم احداً تابع ابن کثیر علیہ (ج ۱ ص ۳۱)

یا مثلاً ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اشربوا فی الظروف ولا تسکروا"

امام نسائی فرماتے ہیں:

وھذا حدیث منکر غلط فیہ ابو الاحوص سلام بن سلیم لا نعلم ان احداً تابعہ علیہ من اصحاب سماک بن حرب وسماک لیس بالقوی وکان یقبل التلقین۔ (ج ۲ ص ۳۳۲)

یا مثلاً

لا نعلم احداً تابع ایمن بن نائل علی ھذہ الروایۃ وایمن عندنا لا باس بہ والحدیث خطاء (ج ۱ ص ۱۸۹)

(باقی)

ادبیات

غزل

از جناب منظور علی صاحب فاروقی تمنا بجنوری

دل و نگاہ کے ہر ہر مقام سے گذری
تمھاری یاد بڑے اہتمام سے گذری

تغیرات سحر سے نہ شام سے گذری
حیات عشق تمھارے ہی نام سے گذری

بہت بلند حدودِ دوام سے گذری
وہ زندگی جو محبت کے نام سے گذری

ہے آج کیفِ محبت بدوشِ میخانہ
ضرور وہ نگہ مست جام سے گذری

ہزار حشر بہ بجاری وہ اک قیامت ہے
گلی میں ان کی جو انکے خرام سے گذری

کمال جلوہ طرازی کے برق وادیٔ طور
جھجک جھجک کے بہت تیر بام سے گذری

تجھے قسم ہے تغافل کی اپنے، فکر نہ کر
کٹے گی شب بھی یونہی جیسے شام سے گذری

وہ چشم مست تو اٹھتی سی بزم میں دیکھی
نہ جانے شیشہ کی پھر کیسے جام سے گذری

وہ خال عارض جاناں بزیر سایۂ زلف
نظر جو دانے پہ ڈالی تھی دام سے گذری

نماز تیرے پرستارِ زلف کی ہے نماز
کہ قبلہ و بندِ قعود و مقام سے گذری

تمنا آج بھی اک راز وہ حقیقت ہے
جو ہر نگاہِ خواص و عوام سے گذری

غزل

از جناب سلام سانگری

حسن بھی لرزتا ہے عشق کے فسانے سے — آپ اور سو جائیں حال دل سنانے سے
ایک داغِ مایوسی ایک داغِ ناکامی — مل گیا جو ملنا تھا عشق کے خزانے سے
التفاتِ پیہم بھی بے تو جہی تیری — اور بھی بھڑک اٹھی شمعِ دل بجھانے سے
کونسی ہے تابانی دامنِ تصور میں — اس جہاں کو نسبت ہے جانے کس زمانے سے
تار کچھ بقا کے تھے دامنِ محبت میں — رشتہ فنا ٹوٹا دل کسی پہ آنے سے
بجلیاں بھی گرتی ہیں پھول بھی بکھرتے ہیں — انقلاب آتے ہیں تیرے مسکرانے سے
برق کا تبسم تھا بادلوں کے پردے میں — نام ہو گیا روشن میرے آشیانے سے
اے سلام ہر دو عالم آج غرقِ مستی ہیں — نغمۂ محبت سے حسن کے ترانے سے

غزل

از جناب کریم الرضا خانصاحب، وکیل شاہجہانپور

منتِ غیر نہ کی جور کا شکوہ نہ کیا — آپ رسوا ہوئے ہم عشق کو رسوا نہ کیا
ہم بھلا ان سے تغافل کا گلہ کیا کرتے — ہم نے خود بیخودیِ شوق میں کیا کیا نہ کیا
کشتیِ شوق نے طوفاں کے تھپیڑے کھائے — ناخدا کا مگر احسان گوارا نہ کیا
دل تو آمادۂ اظہارِ تمنا تھا، مگر — یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا
ترکِ توبہ تو بڑی بات نہ تھی او ساقی — کیا کہیں کس کی نگاہوں نے اشارا نہ کیا
فطرتِ حسن تو ہی عشق کو رسوا کرنا — عشق نے حسن کو رسوا کیا اچھا نہ کیا
ہم تو اربابِ جنوں کے صفِ اول میں رہے — پھر بھی وارفتگیِ شوق کو رسوا نہ کیا

یوں پیدا کیے مشرق نے ہزاروں لیڈر
بعد جوہرؒ[1] کے قلندر کوئی پیدا نہ کیا

[1] مولانا محمد علی جوہر۔

مطبوعات جدیدہ

ترجمان السنۃ جلد سوم — تالیف مولانا بدر عالم صاحب، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت معیاری صفحات ۵۱۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۸ر

پتہ :- ندوۃ المصنفین، دہلی۔

اردو میں احادیث نبوی کے ترجمہ اور تشریح اور اس کے متعلقہ مسائل و مباحث پر بہت سے علماء نے کتابیں لکھی ہیں، مگر جس اہتمام، وسعت نظر اور تحقیق و جامعیت سے مولانا بدر عالم صاحب اس کام کو انجام دے رہے ہیں، وہ اس سے پہلے نہیں ہوا تھا، وہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں ہیں اور احادیث نبوی اور اس سے متعلقہ علوم پر ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے، اس لیے وہ اس اہم کام کو جس خوبی سے انجام دے سکتے ہیں اسکی توقع دوسرے سے نہیں ہو سکتی، چنانچہ ترجمان السنۃ کے نام سے انھوں نے جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کی دو جلدیں پہلے شائع ہو چکی ہیں، یہ تیسری جلد ہے، اس میں قضا و قدر اور نبوت و رسالت جیسے اہم مسائل سے متعلق احادیث کا ترجمہ ضروری تشریحات کے ساتھ کیا گیا ہے، ہر باب کے آغاز میں اس کی مندرجہ احادیث سے پیدا شدہ مباحث اور پیچیدہ مسائل پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے، اور قضا و قدر، رسول کریم کے تذکرہ، عصمت انبیاء اور آخر میں حضرت مسیح کے رفع اور قرب قیامت میں نزول پر بڑی تحقیقی، بصیرت افروز اور سیر حاصل بحث ہے، جابجا مختلف النوع اسرار و نکات اور معارف و حقائق معرض تحریر میں آ گئے ہیں، اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں جدید

ذہن و فکر اور موجودہ رجحانات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، اس کے محاسن کا صحیح اندازہ مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، تمام مسائل میں مصنف کے خیالات سے کلی اتفاق ضروری نہیں، بعض مباحث میں اطناب ہو گیا ہے اور بعض ایسے شبہات قلم انداز ہو گئے ہیں جو موجودہ ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں، مصنف نے ضعیف روایات بھی نقل کی ہیں، اور اس کی ضرورت بھی واضح کی ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر شخص کے لیے قابل قبول ہو، مجموعی حیثیت سے ترجمان السنۃ نہایت مفید، جامع اور موجودہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ایک محققانہ کتاب ہے اور اس کا مطالعہ احادیث کے اساتذہ، طلبہ اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ سب کے لیے یکساں مفید ہے، اللہ تعالیٰ اس مفید اور ضروری کام کی تکمیل کے لیے لائق مصنف کی عمر اور صحت میں برکت دے اور انھیں حدیث نبوی کی اس غیر معمولی خدمت کا اجر عطا فرمائے۔

انوار مصابیح بجواب رکعات تراویح — از جناب مولانا نذیر احمد رحمانی اعظمی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲۸، قیمت عـ۸ر، پتہ: نذیر احمد رحمانی دار الاقامہ نمبر ۱۶/۴۵ پانڈے حویلی بنارس۔

مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی کتاب "رکعات تراویح" پر گذشتہ اشاعت میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، یہ رسالہ اس کا جواب ہے، اسے جماعت اہلحدیث کے مشہور عالم مولانا نذیر احمد رحمانی نے لکھا ہے اور زیر بحث مسئلہ کے متعلق مسلک اہل حدیث پر عائد کردہ الزامات کا محققانہ جواب دینے کی کوشش کی ہے، اس رسالہ میں بھی جا بجا طنز و تعریض اور لہجہ کی درشتی ہے جو اہل علم کے شایان شان نہیں۔ اس طرح کے فروعی مسائل پر وقت اور صلاحیت صرف کرنے کے بجائے اگر ہمارے علما کسی مفید کام میں وقت صرف کرتے تو وہ مسلمانوں کے لیے زیادہ مفید ہوتا،

نوطرز مرصع — مرتبہ ڈاکٹر سید نور الحسن صاحب ہاشمی چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر

صفحات ۳۳۶، قیمت تحریر نہیں، ناشر ہندوستانی اکیڈمی اتر پردیش، الہ آباد

نوطرز مرصع میر محمد حسین عطا خاں تحسین اب بہت کمیاب ہے، اس لیے ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی نے متعدد قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے یہ نسخہ مرتب کر کے ایک مفید مقدمہ اور دیباچہ کے ساتھ شائع کیا ہے، مقدمہ میں تحسین کے حالات، قصہ کے زمانہ، سبب تصنیف، ماخذ اور اسلوب بیان وغیرہ پر بحث کی گئی ہے، اور دیباچہ میں ان تمام نسخوں کا ذکر اور ان کا مقابلہ کیا گیا ہے جو مرتب کے پیش نظر تھے، نوطرز مرصع اپنے دور کے طرز تحریر کا نمونہ اور مرتب کے نزدیک شمالی ہند میں اردو نثر کی پہلی کتاب ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو مرتب اور شائع کر کے ایک مفید ادبی خدمت انجام دی ہے۔

اسباب بغاوت ہند — تالیف سر سید احمد خاں، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۰، مجلد مع مصور گرد پوش، قیمت عـ۲ر ناشر: یونیورسٹی پبلشرز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

سر سید کا رسالہ اسباب بغاوت ہند بہت مشہور ہے جو اس سے پہلے بھی چھپ چکا ہے مگر اب کمیاب تھا، اس لیے یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے اس کو شائع کیا ہے اور فوق کریمی صاحب نے اس کا مقدمہ لکھا ہے، اس میں سر سید کو مخلص اور محب قوم و وطن ثابت کیا گیا ہے اور انگریزوں کی مخالفت سے احتراز اور ان سے دوستی کے بارہ میں ان کے مشورہ کو اس وقت کے تقاضوں اور مصلحتوں کے مطابق قرار دیا گیا ہے، سر سید نے یہ رسالہ اس زمانہ میں لکھا تھا جب کوئی ہندوستانی اس کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، اس سے ان اعتراضات کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے جو ان پر کیے جاتے ہیں۔

رنگ برنگ — شائع کردہ مرکز ادب مدراس، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۹۶ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت عـہر پتہ: تاج بکڈپو مسجد بڑی میٹ مدراس نمبر ۲

مدراس کے چند صاحب ذوق اشخاص نے مرکز ادب کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے، اس میں سرپرست دار المصنفین کے دیرینہ رفیق مولوی محمد یوسف صاحب کوکنی ایم اے (ریڈر مدراس یونیورسٹی) کا نام ہے، ادارہ کا مقصد مدراس کے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کو شائع کرنا ہے، رنگ برنگ اس سلسلہ کی پہلی پیشکش ہے، جو وہاں کے ۱۳ شاعروں کی غزلوں کا منتخب مجموعہ ہے، شروع میں "جھلکیاں" کے زیر عنوان شعراء کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، انتخاب اگرچہ معیاری نہیں مگر ظاہری محاسن کی طرح باطنی محاسن سے خالی بھی نہیں ہے، اس سے مدراس میں اردو شعر و سخن کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، مرکز ادب مدراس کی یہ پیشکش ہمت افزائی اور تحسین کی مستحق ہے، ہم کو توقع ہے کہ وہ آیندہ زبان و ادب کی زیادہ مفید اور قابل قدر خدمات انجام دے گا۔

غلبۂ دین: مرتبہ جناب مولوی سید محمود علی صاحب بخاری، چھوٹی تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۵۴، قیمت عہ، پتہ: شعبۂ تالیف و تصنیف دیندار انجمن آصف نگر، حیدرآباد دکن، اندھرا پردیش۔

مصنف ایک مبلغ ہیں، اس کتاب میں انھوں نے ظلم و فساد کے اسباب اسکی مختلف صورتوں، غلبۂ دین کے تین اہم موانع (اتباع ہوا، آباپرستی اور اہل اقتدار کی اطاعت) اہل حق کیساتھ نصرت الٰہی کے ظہور کی مختلف شکلوں اور آخر میں اہل حق کی ان خصوصیات کا ذکر ہے جس سے وہ نصرت الٰہی کے مستحق ہوتے ہیں، ایک جگہ اس خیال کی تردید کی ہے کہ غلبۂ دین حصول اقتدار کا نام نہیں، یہ تو صحیح ہے کہ غلبۂ دین کا مقصد حصول اقتدار نہیں ہے لیکن قوت و اقتدار کے بغیر دین کا غلبہ کیا اسکا پورا قیام بھی ممکن نہیں ہے، اسی طریقہ سے ختم نبوت کے بعد غلبۂ دین کے لیے سلسلۂ وحی کے قیام کو ضروری قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے، البتہ اگر وحی کے اصطلاحی معنی کے بجائے کسی دوسری نوع کی وحی مراد لیجائے تو اس سے انکار نہیں مگر اس کے لیے کشف و الہام وغیرہ کی اصطلاح موجود ہے، وحی کے لفظ سے ختم نبوت میں التباس پیدا ہو جاتا ہے اس لیے ایسے مشتبہ الفاظ کا استعمال احتیاط کے خلاف ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر کتاب مفید اور مسلمانوں کے پڑھنے کے لائق ہے۔

"ض"

جلد ۸۴ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۹ء نمبر ۶

فہرست مضامین

مضمون	مضمون نگار	صفحات
شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۴۰۲ - ۴۰۴
مقالات		
فقہ اسلامی کے مآخذ	جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی صدر مدرس دار العلوم معینیہ اجمیر	۴۰۵ - ۴۲۲
شیخ الاسلام قطب عالم حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاری اور علم ادب	جناب مولانا سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی	۴۲۳ - ۴۳۵
امام نسائی اور ان کی سنن	جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین	۴۳۶ - ۴۵۰
مسلمانوں کے ہندسی ادب کی ثروت	جناب شبیر احمد خان صاحب غوری ایم اے	۴۵۱ - ۴۵۹
قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمے	جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس	۴۶۰ - ۴۶۸
ادبیات		
ولادت باسعادت	جناب جگن ناتھ صاحب آزاد	۴۶۹ - ۴۷۴
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۴۷۵ - ۴۸۰